الجامعة الاشرفیہ کا دینی و علمی ترجمان

ماہ نامہ

اشرفیہ

مبارک پور

اکتوبر
2025

غوث اعظم رضی اللہ عنہ

حضرت عبدالقادر جیلانی کو روحانیات کے افق پر نہایت بلند مقام حاصل ہے۔ متعدد مآخذ میں انھیں "قطب الاولیاء، قدوۃ العارفین، امام الفریقین" اور "قطب الوجود" جیسے القاب سے یاد کیا گیا ہے۔ صوفیانہ روایات میں انھیں کشف و کرامات کا حامل، اور اہلِ دل کا مرشدِ کامل مانا جاتا ہے۔ ابن عربی، یافعی، ذہبی، اور دیگر بلند پایہ مورخین نے ان کے روحانی مقام کی گواہی دی ہے۔

شیخ عبدالقادر جیلانی نے نہ صرف اپنے وعظ و ارشاد اور روحانی فیوض کے ذریعے اسلامی دنیا کو منور فرمایا، بلکہ کئی گراں قدر تصانیف بھی اپنے پیچھے چھوڑیں، جو صدیوں سے طالبانِ حق کے لیے رہنما چراغ کی حیثیت رکھتی ہیں۔

مبارک حسین مصباحی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بیادگار: حضور حافظِ ملت علامہ شاہ الحاج عبد العزیز قدس سرہٗ بانی الجامعۃ الاشرفیہ

الجامعۃ الاشرفیہ کا دینی و علمی ترجمان

ماہ نامہ اشرفیہ مبارک پور

زیر سرپرستی
عزیز ملت حضرت علامہ شاہ
عبد الحفیظ عزیزی
سربراہِ اعلیٰ
الجامعۃ الاشرفیہ، مبارک پور

THE ASHRAFIA MONTHLY Mubarakpur. Azamgarh (U.P.) India. 276404

جلد نمبر 50 شمارہ 10 | اکتوبر 2025ء | ربیع الثانی 1447ھ

مجلس ادارت

مدیر اعلیٰ : **مبارک حسین مصباحی**
منیجر : محمد محبوب عزیزی
تزئین کار : مہتاب پیامی

مجلس مشاورت

مولانا محمد احمد مصباحی
مفتی محمد نظام الدین رضوی
مولانا محمد ادریس بستوی
مولانا محمد عبد المبین نعمانی

ترسیل زر و مراسلت کا پتہ
دفتر ماہنامہ اشرفیہ، مبارک پور اعظم گڑھ یو۔ پی۔ ۲۷۶۴۰۴

+91 9935162520 (Manager)

زرِ تعاون

قیمت عام شمارہ: 30 روپے
سالانہ (بذریعہ سادہ ڈاک) 300 روپے
سالانہ (بذریعہ رجسٹری) 600 روپے

سری لنکا، بنگلا دیش، پاکستان، سالانہ
750 روپے
دیگر بیرونی ممالک
$25 امریکی ڈالر   £20 پونڈ

نوٹ: آپ ماہنامہ اشرفیہ ہر ماہ انٹرنیٹ پر بھی پڑھ سکتے ہیں۔

http://www.aljamiatulashrafia.org
Email : ashrafiamonthly@gmail.com
mubarakmisbahi@gmail.com
info@aljamiatulashrafia.org

BHIM
BHIM UPI Payments Accepted at
ASHRAFIA MONTHLY

ASHRAFIA MONTHLY
A/c No. 3672174629
Central Bank Of India
Branch : Mubarakpur IFSC : CBIN0284532

اکاؤنٹ میں رقم جمع کرنے کے بعد آفس کے نمبر پر فون کریں یا بذریعہ ڈاک مطلع کریں۔ (منیجر)

مولانا محمد ادریس بستوی نے فیضی کمپیوٹر گرافکس، گورکھ پور سے چھپوا کر دفتر ماہ نامہ اشرفیہ، مبارک پور، اعظم گڑھ سے شائع کیا۔

مشمولات

اداریہ		تری شان سب سے جدا غوث اعظم	مہتاب پیامی 5
قرآنیات	تفہیم قرآن	مونث سماعی (۳)	مولانا محمد حبیب اللہ بیگ ازہری 10
فقہیات	آپ کے مسائل	کیا فرماتے ہیں...	مفتی محمد نظام الدین رضوی 12
نظریات	فکر امروز	بے سوچے سمجھے فون کرنا	مولانا محمد عبد المبین نعمانی قادری 14
		عالم کے قدیم ہونے کا فلسفی نظریہ	مفتی محمد فیضان سرور مصباحی 16
اسلامیات	شعاعیں	مطالعۂ سیرت کیوں اور کیسے؟	آفتاب رشک مصباحی 21
		حدیث قسطنطنیہ اور یزید	محمد تحسین رضا نوری 23
شخصیات	انوار حیات	علامہ سید احمد شاہ قادری سری کوٹی	محمد ضیا نعمانی مصباحی 25
سیاسیات	آئینۂ وطن	مسلمانوں کا سیاسی نصب العین	حافظ افتخار احمد قادری 28
تاریخیات	یاد ماضی	ہجرتوں کا سنگم - وسطی ایشیا کی تاریخ اور مسلم ورثہ	مہتاب پیامی 33
طبیات	حفظان صحت	جدید میڈیکل سائنس اور انسانی صحت	ڈاکٹر انانیہ سرکار 38
بزم خواتین	چراغ خانہ	القابات اور عملی مقامات	سلمٰی شاہین امجدی 40
بزم دانش	فکر و نظر	اخلاق نبوی اور آج کی مسلم قیادت	مفتی توفیق احسن برکاتی/مفتی محمد اعظم مصباحی 41
ادبیات	گوشۂ ادب	الذکر و المختصر فی القطب المزدہر (۱)	مولانا محمد طفیل مصباحی 47
	نقد و نظر	مناقب اہل بیت اطہار اور امام احمد رضا	تبصرہ نگار: مفتی محمد اعظم مصباحی 51
مکتوبات	صدائے بازگشت	عادل رضا پورنوی/محمد شارق نظامی کو شامی	53
سرگرمیاں	عالمی خبریں	چین میں انسان نما روبوٹ کا پی ایچ ڈی میں داخلہ	55
	خیر و خبر	○ جامعہ اشرفیہ میں حضرت سید جامی اشرف کچھوچھوی کی آمد ○ دار العلوم قادریہ چریا کوٹ میں ذکر شہدائے کربلا ○ میلاد مصطفیٰ کی شرعی ثبوت، رسمِ اجرا ○ الجامعۃ الغوثیہ للبنات میں عرسِ اعلیٰ حضرت	56
منظومات	خیابانِ حرم	نویدِ سحر	شہناز خاتون چشتی 58

اداریـــــــہ

تری شان سب سے جدا غوث اعظم

مہتاب پیامی

وہ 471 ہجری کی ایک کرامت خیز صبح تھی، جب گیلان کی وادیوں سے ولایت کا آفتاب طلوع ہوا۔ ہواؤں میں ایثار کی خوشبو گھلی، اور ایک ایسا نخلِ نور نمودار ہوا جس کے سائے نے بغداد سے لے کر ہند و خراسان تک دلوں کو فرحت انگیز سایہ بخشا۔ یہ وہی لمحہ تھا جب عبدالقادر کا نام تقدیر کے قلم سے لکھی جانے والی روحانی تاریخ میں ثبت ہوا۔ گیلان یا جیلان کی نسبت سے آپ کو جیلی یا جیلانی کہا گیا، اگرچہ بعض مؤرخین نے بغداد کو بھی مقامِ ولادت قرار دیا ہے، مگر گیلان کی مٹی ہی ہے جس میں آپ کا پہلا نور بکھرا۔

آپ نہ صرف فقہِ حنبلی کے امام تھے، بلکہ مشک بار گلشن حدیث کے رکھوالے، اور سلوک کے پیچیدہ راستوں کے سالک تھے، آپ کے قدموں کے نشان آج بھی قلوبِ عاشقاں کی راہنمائی کرتے ہیں۔

آپ کے والد کے نام میں اختلاف ہے۔ کچھ مورخین کا کہنا ہے کہ آپ کے والد کا نام عبداللہ تھا اور "ابوصالح" کے لقب سے یاد کیے جاتے تھے، بعض دیگر کے نزدیک آپ کے والد موسیٰ بن عبداللہ تھے، جو "جنگی دوست" کے خطاب سے پہچانے جاتے تھے۔ مگر دونوں صورتوں میں سچائی یہ ہے کہ وہ صدق و صفا، طہارت و کرامت کے پیکر تھے، اور ان کی روحانی میراث، حضرت شیخ کے قلب میں نور بن کر چمکی۔

نسب کے حوالے سے بھی کئی داستانیں سنائی دیتی ہیں۔ کچھ روایات آپ کو ساداتِ حسنی میں شمار کرتی ہیں، ان کا شجرہ نسب امام حسن بن علی رضی اللہ عنہ تک جا پہنچتا ہے۔ ایرانی محققین بشمول یافعی، صفدی، اور ابنِ عماد نے بھی اس نسبت کو بڑے وثوق سے نقل کیا ہے، مگر کچھ دیگر اہلِ تحقیق کا کہنا ہے کہ یہ دعویٰ بعد میں آپ کے ایک پوتے، نصر بن ابوبکر نے بغیر کسی معتبر سند کے کیا۔ مگر شیخ کی اپنی آواز، جو قصیدۂ غوثیہ کے دریچوں سے آرہی ہے، اس اعلیٰ نسب کی گواہی دیتی ہے۔ اپنے اشعار میں آپ نے خود کو ساداتِ حسنی قرار دیا، اور بہت سے علمائے انساب نے بھی اس دعوے پر اپنی مہرِ تصدیق ثبت کی۔

آپ کی والدہ محترمہ فاطمہ بنت ابوعبداللہ تھیں، جنہیں ام الخیر کہا جاتا تھا، وہ زہد کا مجسمہ، عبادت کی پیکر، اور روحانی کشف و کرامات کی امین تھیں۔ ان کا تعلق بھی ان اولیا سے تھا جن کے سجدے زمین کو مقدّس بناتے، اور جن کی خاموشی میں عرفانی صدائیں گونجتی تھیں۔

آپ کی ایک پھوپھی بھی تھیں "ام محمد عائشہ" شب زندہ دار خاتون تھیں اور خلوتوں میں مالکِ حقیقی سے سرگوشیاں کیا کرتی تھیں، ان کی روحانی شان ایسی تھی کہ وقت کے اولیا بھی ان سے کسبِ فیض کیا کرتے تھے۔

سچ تو یہ ہے کہ یہ خاندان نہ صرف علم و معرفت کا مرکز تھا، بلکہ وہ سرچشمہ تھا جہاں سے طریقت کی ندیاں پھوٹیں، اور سلوک کا دریا رواں دواں ہوئے۔

شیخ عبدالقادر جیلانی کی ابتدائی زندگی کے بارے میں زیادہ معلومات تو تاریخی دُھند میں چھپی ہوئی ہیں، اور جو کچھ ملتا ہے وہ یا تو غلو سے معمور ہے یا پھر افسانوی رنگ میں رنگا ہوا۔ کچھ روایات میں آپ کی نوجوانی کے وہ سخت ایام بیان کیے گئے ہیں جب آپ عراق پہنچ کر

payamee@gmail.com/Contact:9235647041

کھنڈرات میں بسر کرتے، اور فاقہ اور پیاس کی ہم نشینی میں گزر کرتے۔ مگر ان اقوال میں حقیقت سے زیادہ سلوک کی علامتی سختی بولتی ہے۔

ہاں، یہ بات واضح ہے کہ آپ نے اٹھارہ برس کی عمر میں بغداد کا رُخ کیا، وہ شہر جو اس دور میں علم و عرفان کا قبلہ تھا۔ وہاں آپ نے نحو، لغت، تفسیر، حدیث، فقہ اور اصول کے گلشنوں میں قدم رکھا۔ اور پھر، علم کی جس راہ پر چلے، اس میں فقر و فاقہ آپ کے ہم سفر بنے، مگر ہمت نہ تھکی، دل نہ ٹوٹا۔ اپنے شب و روز کو علم کی شمع پر پروانہ وار نثار کیا۔

بغداد میں آپ نے یحییٰ بن علی تبریزی سے علومِ ادبیہ، اور ابوسعد مبارک بن علی مخرمی حنبلی سے علم فقہ حاصل کیا۔ انھی مخرمی سے آپ کو خرقۂ طریقت بھی حاصل ہوا، یہ وہ خرقہ تھا جو بعد میں طریقۂ قادریہ کی زنجیر کا پہلا حلقہ بنا۔ اس کے علاوہ آپ نے محفوظ بن احمد کلوذانی، ابوالوفا علی بن عقیل، اور دیگر جلیل القدر علما و مشائخ سے بھی علمِ فقہ حاصل کیا۔ علمِ حدیث کی خوشبو آپ نے احمد بن منظفر تمار، محمد بن حسن باقلانی، جعفر بن احمد سراج، ابوطالب بن یوسف سمیت دیگر محدثین سے کشید کی۔

علم و عرفان کی راہوں پر حضرت عبدالقادر جیلانی کا سفر صرف کتابوں، مدرسوں اور درس گاہوں تک محدود نہ تھا۔ جیسا کہ بتایا گیا،، آپ نے نہ صرف ابوسعد مخرمی جیسے جلیل القدر شیخ سے خرقۂ طریقت حاصل کیا، بلکہ دیگر مشائخِ سلوک سے بھی روحانی خوشبو حاصل کی، جن میں حمّاد بن مسلم دبّاس کا ذکر خاص طور پر کیا جاتا ہے۔ دباس وہ بزرگ تھے جن کی صحبت میں حضرت عبدالقادر نے کچھ وقت گزارا، اور وہیں سے طریقت کی کئی راہیں آپ کے قلب پر منکشف ہوئیں۔

شیخ ابوسعد مخرمی، جن کی وفات 513 ہجری میں ہوئی، انھوں نے بغداد کے مشرقی حصے میں واقع "باب الاَزَج" کے مقام پر ایک مدرسہ قائم کیا تھا۔ یہ مدرسہ انھوں نے شیخ عبدالقادر کے سپرد کر دیا، اور پھر تاریخ نے وہ منظر دیکھا جب 521 ہجری میں پہلی مرتبہ آپ نے اسی مدرسہ میں وعظ کی مجلس آراستہ کی۔ یہ صرف مجلس موعظہ نہ تھی بلکہ روح کی پرواز تھی، دلوں کی کھڑکیوں سے اترتی ہوئی روشنی تھی جس کی طرف سیکڑوں نہیں، ہزاروں نہیں، ستر ہزار افراد تک کھنچے چلے آئے — گو یہ عدد مبالغہ ہو، مگر محفلِ وعظ میں خلقِ خدا کی کثرت تو اس سے ثابت ہو ہی جاتی ہے، حقیقتاً آج بھی بغداد کی فضا گواہ ہے کہ ایک مردِ خدا نے دلوں کو بیدار کر دیا۔

وعظ کی محفلوں میں خلقت کے ہجوم سے جب مدرسے کی حدود تنگ پڑ گئیں تو اس عظیم مجاہدِ وقت نے شہر کی حدود سے نکل کر سورِ بغداد کے نزدیک وعظ کے اجتماعات منعقد کیے۔ پھر کچھ صاحبِ ثروت مریدوں نے مالی اعانت فراہم کی، اور 528 ہجری میں مدرسے کی توسیع عمل میں آئی۔ اب وہی جگہ، جو ایک چھوٹا سا دینی مرکز تھی، فتوے، تدریس، وعظ اور خطاب کا بحرِ ناپیدا کنار بن گئی۔

کہا جاتا ہے کہ آپ کے کلام کا دلوں پر ایسا اثر ہوتا کہ لوگ روتے روتے گناہوں سے تائب ہوتے، اور غیر مسلموں کی کثیر تعداد؛ بعض روایات کے مطابق پانچ پانچ سو سے زائد اہلِ کتاب؛ آپ کی مجلسوں میں کلمۂ حق ادا کر کے اسلام میں داخل ہو جاتے۔ شیخ عبدالقادر صرف واعظ نہ تھے، بلکہ آئینہ تھے، جس میں ہر سننے والا اپنا باطن دیکھ لیتا، اور اسے پاک کرنے کی تڑپ لے کر اٹھتا۔ یہ حقیقت اپنی جگہ مسلم ہے کہ آپ کی مجالس صرف عوامی موعظہ تک محدود نہ تھیں؛ بڑے بڑے علما و فقہا بھی آپ کی نشست میں شریک ہوتے، اور آپ کے لبوں سے نکلا ہوا ہر لفظ ان کے علم کا رزق بنتا۔ یوں آپ کی محفل علم کا سمندر، سلوک کا مدرسہ، اور ہدایت کا آسمان بن گئی۔

کہا جاتا ہے کہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی نے جب بغداد کی گلیوں میں وعظ و تلقین کے دریا بہائے اور ذکرِ خدا سے شہر کی فضا معطر کی، تو اس کے کچھ دنوں بعد یک لخت خلوت گزین ہو گئے۔ بعض روایات کے مطابق، یہ گوشہ نشینی محض طبیعت کی خلوت پسندی نہ تھی بلکہ ایک مجذوبانہ رجعت تھی — بیابانوں کی خاک، کھنڈرات کی خاموشی، اور باطن کی آگ میں تپنے کی ایک شعوری واپسی۔ اسی دورِ

خلوت میں آپ نے شیخ حماد دباس کی صحبت اختیار کی اور وہ اسرارِ طریقت جو محض علم سے نہیں بلکہ سوزِ دل سے حاصل ہوتے ہیں، آپ نے انھی کے فیوضِ قدم سے حاصل فرمائے اور پھر، 521 ہجری میں، آپ ایک بار پھر خلوت سے جلوت کی طرف لوٹے، مگر اس بار آپ کا کلام فقط "عالم کا بیان" نہ تھا، بلکہ "ولی کا الہام" بن چکا تھا۔

حضرت عبدالقادر جیلانی اپنے وقت کے جلیل القدر حنبلی فقیہ، محدث اور شیخ الاسلام تھے۔ آپ کا فتوائی دائرہ صرف فقہِ حنبلی تک محدود نہ تھا، بلکہ آپ نے فقہِ شافعی میں بھی فتاوے دیے۔ بغداد کے علما، فقہا، متکلّمین اور عوام الناس سبھی آپ کے حلقۂ درس و فیض میں شریک ہوتے، لوگ آپ سے اصول، تفسیر، حدیث، کلام اور فقہ سیکھتے، اور علم و نور کا ایک مشترک منبع آپ کی زبانِ گویا سے جاری رہتا۔

آپ سے علم حاصل کرنے والوں کی فہرست مختصر نہیں: ابوسعد سمعانی، عمر بن علی قرشی، موفق الدین ابن قدامہ، عبداللطیف قیطی، محمد بن مبارک قلانسی، یحییٰ بن سعداللہ تکریتی، اور خود آپ کے فرزند عبدالرزاق اور موسیٰ، جنھوں نے اپنے والد کے علم و عرفان کے چراغ کو آگے بڑھایا۔ یہاں تک کہ تاج النساء بنت فضائل بن علی تکریتی جیسی عالمہ خاتون بھی آپ کی مجالسِ حدیث کی مستفیدہ شمار کی گئیں۔

آپ کا دائرۂ تربیت صرف ظاہر کی حدوں تک مقید نہ تھا، وہ سالکانِ راہِ سلوک کے لیے مشعلِ راہ بھی تھے، مرشدِ کامل بھی، اور مربیِ قلوب بھی۔ بہت سے مرید آپ سے خرقہ پاکر خلفا کی صف میں داخل ہوئے اور آپ کی طریقت کو زمانوں میں پھیلایا۔ ان میں شہاب الدین عمر سہروردی اور احمد بن ابوبکر (ابن شبلی زاہد) کے نام درخشاں ستاروں کی مانند ہیں۔

آپ کی طریقت کی بنیاد شریعت کی سخت پاسداری، ذکرِ دائمی، نفیِ نفس، فناء فی اللہ، توحید، تفویض، توبہ، زہد، تفقہ، محبتِ الٰہی، ایثار، دنیا سے قلب کا انقطاع، ریا اور کبر و نفاق جیسے باطنی امراض سے اجتناب پر استوار تھی۔ آپ کے مکتب کی روح سادگی، صداقت اور خدا پر کامل اعتماد تھی۔ طریقۂ قادریہ میں نجات کا راستہ نہ مجازی تصورات سے گزرتا ہے اور نہ خرقِ عادت کے مظاہرے سے، بلکہ یہ ایک مسلسل تزکیۂ نفس، محبتِ ربّ اور اطاعتِ رسول کا نام ہے۔

البتہ یہ بھی سچ ہے کہ آپ کی طرف بعض ایسی شطحیات اور طامات منسوب کی گئیں جنھیں بعض ناقدین نے تنقید کا نشانہ بنایا۔ کچھ نے ان اقوال کو مبالغہ قرار دیا، کچھ نے انھیں عشق کی بے خودی کا مظہر کہا، اور کچھ نے انھیں تصوف پر خلطِ واقعیت کے سائے۔ مگر اہلِ دل جانتے ہیں کہ جہاں عشق بولتا ہے، وہاں عقل تھوڑی دیر خاموش ہو جاتی ہے۔

شیخ عبدالقادر کا تربیتی اسلوب نہایت معتدل تھا۔ اپنے مریدوں کو سماع سے مطلق منع نہیں فرمایا، مگر اس کے لیے ایسے شروط مقرر کیے کہ ذکرِ الٰہی کی مجالس میں کوئی شائبۂ غفلت نہ در آئے۔ آپ کے نزدیک سماع کی روح، قلب میں رب کی یاد کا تلاطم تھی، نہ کہ جسم کی لذت یا وجد کی بے ضابطگی۔ آپ آلاتِ موسیقی کو سماع میں شامل کرنے کو قطعی طور پر غلط سمجھتے تھے اور مجلس میں مشایخ کی حرمت کو لازم قرار دیتے تھے۔ یوں شیخ عبدالقادر جیلانی نے ظاہر و باطن، شریعت و طریقت، علم و عمل، اور ذکر و فکر کو ایک ایسے حسین امتزاج میں ڈھالا، جس نے قادری سلسلے کو دوام بخشا۔

شیخ عبدالقادر جیلانی نے 561ھ میں وصال فرمایا، اور آپ کو آپ کے اپنے قائم کردہ مدرسے ہی میں سپردِ خاک کیا گیا۔ یہ مدرسہ نہ صرف آپ کی حیات میں علم و ہدایت کا مرکز تھا، بلکہ آپ کی وفات کے بعد بھی علم و روحانیت کا چراغ بن کر روشن رہا۔ آپ کے

فرزندان واحفاد نے اسی مدرسے میں تدریسی فرائض سرانجام دیے، اور وقت کے ساتھ ساتھ ان میں سے کئی افراد کو بھی وہیں دفن کیا گیا۔ انھیں مزارات کے مجموعے کو "الحضرۃ القادریۃ" یا "الحضرۃ الگیلانیۃ" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، جو بغداد کی روحانی تاریخ کا زریں باب ہے۔

شیخ کے وصال کے بعد، مدرسے کے ساتھ متّصل ایک مسجد کی بنیاد بھی رکھی گئی۔ یہ مسجد تاریخ کے کئی نشیب و فراز سے گزری، حتیٰ کہ ہلاکو خان کے حملے (656ھ) میں یہ ویران ہوگئی۔ بعد ازاں، خلافتِ عثمانیہ کے جلیل القدر سلطان سلیمان قانونی (حکومت: 1520–1566ء) کے حکم سے 941ھ میں اس کی از سر نو تعمیر کی گئی۔ اس کے بعد سلطان مراد چہارم (حکومت: 1623–1640ء) اور دیگر عثمانی حکام نے مسجد و مدرسہ کی وسعت اور تزئین و آرائش پر خصوصی توجہ دی۔ میناروں، صحنوں، حجرات اور دیگر تعمیرات کا اضافہ اسی دور میں ہوا۔ ان میں مصلیٰ تابستانی، رواق شرقی، منارۂ کبیر، منارۂ صغیر (منارۂ سید سلمان نقیب)، اور برجِ ساعت قابل ذکر ہیں۔

حضرت عبدالقادر جیلانی کو روحانیات کے افق پر نہایت بلند مقام حاصل ہے۔ متعدّد مآخذ میں انھیں "قطبُ الاولیاء، قدوۃ العارفین، امام الفریقین" اور "قطب الوجود" جیسے القاب سے یاد کیا گیا ہے۔ صوفیانہ روایات میں انھیں کشف و کرامات کا حامل، اور اہلِ دل کا مرشدِ کامل مانا جاتا ہے۔ ابن عربی، یافعی، ذہبی، اور دیگر بلند پایہ مؤرخین نے ان کے روحانی مقام کی گواہی دی ہے۔

شیخ عبدالقادر جیلانی نے نہ صرف اپنے وعظ و ارشاد اور روحانی فیوض کے ذریعے اسلامی دنیا کو منور فرمایا، بلکہ کئی گراں قدر تصانیف بھی اپنے پیچھے چھوڑیں، جو صدیوں سے طالبانِ حق کے لیے رہنما چراغ کی حیثیت رکھتی ہیں۔

آپ کی معروف تصانیف میں سرِفہرست:

● ''الغنية لطالبي طريق الحق'' ہے، جو راہِ حقیقت کے جویاؤں کے لیے قیمتی سرمایہ ہے۔ یہ کتاب پہلی بار 1288ھ میں قاہرہ اور مکّہ میں زیورِ طبع سے آراستہ ہوئی۔

اسی طرح آپ کے وعظ و نصائح پر مشتمل:

● "الفتح الرباني و الفيض الرحماني" ہے، جسے "ستین مجالس" بھی کہا جاتا ہے۔ اس کی پہلی اشاعت 1318ھ میں قاہرہ میں ہوئی۔

دیگر کتب میں "سر الأسرار و مظهر الأنوار فيما يحتاج إليه الأبرار" اور "آداب السلوك و التوصل إلى منازل الملوك" شامل ہیں، جن میں دوسری کتاب 1281ھ میں استنبول سے شائع ہوئی۔

● "الفيوضات الربانية في المآثر و الأوراد القادرية" مطبوعہ مصر۔
● "فتوح الغيب" مطبوعہ قاہرہ و استنبول 1357ھ.
● "ملفوظات قادریہ"
● "یواقیت الحکم"
● "بشائر الخیرات" (درودِ نبوی کے صیغوں پر مشتمل، مطبوعہ بولاق 1292ھ و اسکندریہ 1304ھ)

یہ کتب بھی قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ—

● "جلاء الخاطر فی الباطن والظاهر" بھی آپ کے عرفانی مکاشفات کا مجموعہ ہے۔
بعض مآخذ میں آپ سے منسوب دیگر تصانیف کا بھی ذکر ملتا ہے، جیسے:

● "معراج لطيف المعانى" ● "مراتب الوجود"
● "تحفة المتقين و سبيل العارفين" ● "جواهر الرحمن"
● "الكبريت الأحمر" ● "مثنوى فتوح الحرمين"
● "هادى السلوك"۔ اگرچہ ان میں بعض کی نسبت حضرت شیخ سے قطعی ثابت نہیں۔

ابنِ کثیر جیسے محققین اس امر کے قائل ہیں کہ شیخ عبدالقادر کی تصانیف علم و حکمت سے لبریز ضرور ہیں، مگر ان میں بعض ضعیف یا موضوع احادیث کا احتمال بھی پایا جاتا ہے۔

تحریری آثار کے علاوہ، شیخ کے عارفانہ اقوال اور ملفوظات بھی معروف ہیں۔ یافعی نے اپنی تصانیف "نشر المحاسن" اور "خلاصة المفاخر" میں ان میں سے بہت سے اقوال کو محفوظ کیا ہے۔

شیخ عبدالقادر جیلانی اہلِ سخن بھی تھے۔ فارسی اشعار میں وہ "محی" تخلص کرتے تھے، اور ان کے اشعار "دیوانِ غوثِ اعظم" یا "دیوانِ محیی گیلانی" کے نام سے معروف ہیں۔

مؤرخین کے مطابق آپ کی 49 اولادیں تھیں، 27 صاحب زادے اور 22 صاحب زادیاں۔ ان میں سے چند معروف نام درج ذیل ہیں:

● محمد ابوالفضل ● عبداللہ ● عبدالرزاق ● عبدالعزیز ● عبدالوھاب ● موسیٰ ● اور عیسیٰ۔

آپ کی نسل اور ذریہ پر مبسوط کتب بھی تحریر کی گئیں، جن میں:

● "ضم الأزهار إلى تحفة الأبرار" از: محمد سعدی ازہری جیلانی۔ اور
● "شمس المفاخر في ذكر ذرية سلطان الأولياء" از: محمد بن محمد نجشی حلبی، قابل ذکر ہیں۔

شیخ عبدالقادر جیلانی کے روحانی مرتبے اور کرامات پر سیکڑوں کتب تحریر کی گئیں، جن میں سے چند مشہور یہ ہیں:

● مناقب الشيخ عبدالقادر الجيلاني ● الأشراف على نسب الأقطاب الأربعة
● اسنى المفاخر ● بهجة الأسرار و معدن الأنوار
● قلائد الجواهر ● الجنى الداني فى مناقب الجيلاني
● الروض الزاهر ● خلاصة المفاخر
● نشر المحاسن الغاليه ● نزهة الخاطر الفاتر
● قصيدة الباز الاشهب ● گلدستۂ کرامات، وغیرہ۔

یہ تمام آثار اور مناقب، حضرت غوث الاعظم کی ہمہ گیر شخصیت، ان کی علمی رفعت، روحانی جاذبیت، اور امتِ مسلمہ میں ان کے گہرے اثرات کا شاہکار مظہر ہیں۔ اللہ جل شانہ ہمیں اور آپ کو حضور غوث اعظم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی تعلیمات و تحریرات سے مستفیض ہونے کی توفیق عطا فرمائے اعور فیوضاتِ غوثیہ سے مالامال فرمائے۔ آمین۔ ■■■

تفہیم قرآن 3

مؤنث سماعی

محمد حبیب اللہ بیگ ازہری

(1)-قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَ مَنِ اتَّبَعَنِيْ وَ سُبْحٰنَ اللّٰهِ وَ مَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ. [یوسف:108]

ترجمہ: اے نبی! آپ کہہ دو کہ یہ میرا راستہ ہے، میں بصیرت کے ساتھ اللہ کی طرف بلاتا ہوں اور میرے پیروکار بھی، اللہ کے لیے پاکی ہے اور میں مشرک نہیں ہوں۔

اس آیت میں "سبیل" کے لیے اسم اشارہ "هذه" مؤنث لایا گیا ہے، جو اس بات پر دلیل ہے کہ عربی زبان میں لفظ "سبیل" مؤنث استعمال کیا جاتا ہے۔

(2)- وَ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ وَ لِتَسْتَبِيْنَ سَبِيْلُ الْمُجْرِمِيْنَ. [الانعام:55]

اس آیت میں "سبیل" کے لیے "تستبین" مؤنث کا صیغہ ذکر کیا گیا ہے، جو اس بات کا غماز ہے کہ عربی زبان میں "سبیل" مؤنث استعمال کیا جاتا ہے۔

(3)-وَ عَلَى اللّٰهِ قَصْدُ السَّبِيْلِ وَ مِنْهَا جَآئِرٌ وَ لَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ. (النحل:9)

ترجمہ: راہ راست کی رہ نمائی اللہ کے ذمۂ کرم پر ہے اور کچھ راستے ٹیڑھے بھی ہوتے ہیں اور اگر اللہ چاہتا تو تم سب کو ہدایت یافتہ بنادیتا۔

اس آیت مبارکہ میں کلمہ "وَمِنْهَا" میں جو ضمیر مؤنث ہے؛ وہ سبیل کی جانب راجع ہے، جس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ سبیل مونث ہے۔ مذکورہ بالا تینوں آیات میں ذکر کیے گئے اسم اشارہ، فعل اور ضمیر عائد کے مطابق سبیل مؤنث ہے، جب کہ ایک دوسری آیت کے مطابق سبیل مذکر ہے، ارشاد باری:

سَاَصْرِفُ عَنْ اٰيٰتِيَ الَّذِيْنَ يَتَكَبَّرُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ؕ وَ اِنْ يَّرَوْا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوْا بِهَا ۚ وَ اِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الرُّشْدِ لَا يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا ۚ وَ اِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الْغَيِّ يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَ كَانُوْا عَنْهَا غٰفِلِيْنَ. [الاعراف:149]

اس آیت میں "لَا يَتَّخِذُوْهُ" اور "يَتَّخِذُوْهُ" میں جو ضمیر ہے؛ وہ لفظ سبیل کی جانب راجع ہے، جس سے اس امر کی تائید ہوتی ہے کہ سبیل مذکر ہے، اسی لیے لفظ سبیل کے حوالے سے عربی معاجم میں صراحت کے ساتھ مذکور ہے: يذكر و يؤنث. یعنی لفظ سبیل کبھی مذکر اور کبھی مؤنث استعمال کیا جاتا ہے۔

السعیر: یہ جہنم کے ناموں میں سے ایک نام ہے اور مؤنث سماعی ہے، ارشاد باری ہے:

اِنَّ اللّٰهَ لَعَنَ الْكٰفِرِيْنَ وَ اَعَدَّ لَهُمْ سَعِيْرًا ۝ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۚ لَا يَجِدُوْنَ وَلِيًّا وَّ لَا نَصِيْرًا [الاحزاب:64-65]

ترجمہ: کافروں پر اللہ کی لعنت ہے اور اللہ نے ان کے لیے سعیر یعنی جہنم تیار کر رکھا ہے، جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔

اس آیت میں "فِيهَا" میں جو ضمیر مؤنث ہے؛ وہ "سعیر" کی جانب راجع ہے اور اس حقیقت کو بے نقاب کر رہی ہے کہ لفظ "سعیر" عربی زبان میں مؤنث ہے۔

واضح رہے کہ جہنم، نار کی ایک قسم ہے، لہذا جہنم اور اس کے تمام طبقات کے نام مؤنث ہوں گے، اس لیے "جحیم، حطمة، سعیر، سقر اور لظی" وغیرہ کلمات مؤنث استعمال

استاذ جامعہ اشرفیہ، مبارک پور

کیے جاتے ہیں۔

السمآء: اس کا معنی آسمان ہے، اس کے علاوہ بادل، بارش اور چھت کے لیے بھی بولا جاتا ہے، یہ لفظ کسی بھی معنی میں ہو مؤنث ہوتا ہے، ارشاد باری ہے:

اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ. [الانفطار:1]

دوسرے مقام پر فرمایا:

اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ. [الانشقاق:1]

یعنی جب آسمان پھٹ جائے گا۔

ان دونوں آیات میں "سمآء" بمعنی آسمان کے لیے مؤنث کے صیغے وارد ہوئے ہیں، جس سے بجا طور پر یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ "سمآء" مؤنث سماعی ہے۔

السن: یہ دانت اور عمر کے معنی میں آتا ہے، دونوں صورتوں میں مؤنث ہوتا ہے اور، اور کبھی سن کا اطلاق کسی بھی نوکیلی چیز پر ہوتا ہے، مثلاً اسنان المشط یعنی کنگھی کے دندانے۔

الشمس: سورج کو کہتے ہیں اور یہ مؤنث سمائی ہے، قرآن پاک کی متعدّد آیات میں کلمہ "شمس" مؤنث کے صیغے کے ساتھ مذکور ہے، ارشاد باری ہے:

اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ. [التکویر:1]

یعنی جب سورج بے نور ہو جائے گا۔

وَ الشَّمْسِ وَ ضُحٰىهَا. [الشمس:1]

یعنی سورج اور اُس کی چمک کی قسم۔

ان دونوں آیات میں شمس کے لیے فعل اور ضمیر مؤنث لائی گئی ہے، جس سے اس بات کا ثبوت فراہم ہوتا ہے کہ شمس مؤنث سمائی ہے۔

الضلع: اس کا معنی پہلی ہے، اس کی جمع: "أضلع" اور "أضلاع" ہے، یہ ضاد کے کسرے اور لام کے فتحہ یا سکون کے ساتھ ہے، تاج العروس میں ہے کہ لام کے فتحہ کے ساتھ حجازی اور سکون کے ساتھ تمیم کی لغت ہے، ضلع مؤنث ہے اور کبھی مذکر بھی استعمال ہوتا ہے۔

الطاغوت: سرکشی میں حد سے تجاوز کرنے والے کو کہتے ہیں، یہ واحد و جمع اور مذکر و مؤنث کے لیے یکساں طور پر بولا جاتا ہے اور اس کی تذکیر و تانیث میں مدلول کا لحاظ کیا جاتا ہے، یعنی اگر طاغوت بول کر سرکش انسان مراد لیا جائے تو مذکر ہوگا؛ کیوں کہ انسان مذکر ہے، اور اگر طاغوت بول کر بت یا صنم مراد لیا جائے تو مؤنث ہوگا؛ کیوں کہ بتوں کے نام عموماً مؤنث ہوتے ہیں، قرآن پاک میں دونوں نظیریں ملتی ہیں، طاغوت بمعنی سرکش انسان کو مذکر ذکر کیا، فرمایا:

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَ مَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَ قَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ ؕ وَ يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّضِلَّهُمْ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا. [النساء:60]

ترجمہ: کیا آپ نے انھیں نہیں دیکھا جو گمان کرتے ہیں کہ وہ آپ پر اور آپ سے پہلے نازل ہونے والی کتاب پر ایمان لے آئے ہیں، وہ چاہتے ہیں کہ اپنا مقدمہ ایک طاغوت یعنی سرکش انسان کے پاس لے کر جائیں، حالاں کہ انھیں حکم دیا گیا تھا کہ وہ اس سرکش کی بات نہ مانیں اور شیطان چاہتا ہے کہ انھیں مکمل طور پر گم راہ کردے۔

اس آیت کریمہ میں "اَن یَکفُرُوا بِہ" میں جو ضمیر مذکر ہے؛ وہ طاغوت کی جانب راجع ہے، جس سے مراد ایک یہودی شخص ہے، اور وہ کعب ابن اشرف ہے۔ اس آیت میں "طاغوت" بمعنی انسان کے لیے مذکر کی ضمیر ذکر کی گئی ہے، اور ایک دوسری آیت میں "طاغوت" بمعنی بت کا ذکر کیا اور اس کے لیے مؤنث کی ضمیر ذکر کی، فرمایا:

وَ الَّذِيْنَ اجْتَنَبُوا الطَّاغُوْتَ اَنْ يَّعْبُدُوْهَا وَ اَنَابُوْٓا اِلَى اللّٰهِ لَهُمُ الْبُشْرٰى ۚ فَبَشِّرْ عِبَادِ. [الزمر:17]

ترجمہ: جن لوگوں نے طاغوت یعنی بت کی عبادت سے اجتناب کیا اور اللہ کی طرف رجوع کیا، ان کے لیے خوش خبری ہے۔ (جاری)۔□□□

فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ

آپ کے مسائل

کیا فرماتے ہیں مفتیانِ دین سوال آپ بھی کر سکتے ہیں

مفتی محمد نظام الدین رضوی

عید گاہ کے اوپر چھت ڈالنے کا مسئلہ

سوال: کیا فرماتے ہیں مفتیان شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں زید عید گاہ کے اوپر چھت ڈھالنا چاہتا ہے دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا عید گاہ کے اوپر چھت ڈھالنا جائز ہے یا نہیں؟ زید کہتا ہے کہ میں نے فلانے فلانے جگہ عید گاہ چھت والا دیکھا ہے تو کیا عید گاہ کے اوپر چھت ڈھالا جا سکتا ہے؟ بہر دو صورت بالدلائل مسئلے کو واضح فرمائیں۔ اگر جائز نہیں تو حرام مکروہ تحریمی، مکروہ تنزیہی خلاف اولیٰ جو بھی ہو مسئلہ کو واضح فرما کر عنداللہ ماجور ہوں۔ فقط والسلام

الجواب: عید گاہ پر چھت ڈھالنا حرام یا مکروہ تحریمی یا ناجائز نہیں، خلاف سنت ہے۔ اور سنت سے مراد سنت مستجبہ ہے۔

ہاں اگر عید گاہ پہلے سے وقف ہو تو چھت ڈھالنے سے شکل وقف کی تغییر بھی ہوگی جو ناجائز ہونا چاہیے۔

عہد رسالت میں نماز کھلے میدان میں پڑھی جاتی تھی اور بعد کے ادوار میں بھی علما، فقہا، صوفیا، صلحا اور عامہ مسلمین کا عمل اسی پر رہا۔ فرق یہ ہے کہ عہد رسالت و عہد سلف میں عید گاہ کے ارد گرد احاطہ بندی کا ذکر نہیں ملتا جس کی دلیل یہ ہے کہ وہ حضرات عید کی نماز کے لیے "خروج إلى الجبانة" یا خروج إلى الصحراء کا ذکر کرتے ہیں اور جبانۃ یا صحراء سے مراد کھلا میدان ہے اور ادھر ہمارے دور میں احاطہ بندی ہوتی ہے۔ جس کا مقصد اس میں جانوروں کے آنے جانے اور آلودگی سے حفاظت ہے، ساتھ ہی قانونی تحفظ اور امتیاز بھی۔

لیکن کھلے میدان کا مقصد بڑی حد تک پھر بھی حاصل رہتا ہے۔ کیوں کہ کھلے میں نماز عید سے مقصود شان و شوکت کا اظہار ہے جو بہر حال حاصل ہے۔ اور آج کے حالات میں احاطہ بندی کی شرعاً حاجت بھی ہے۔ اس لیے اس حد تک علما نے گنجائش رکھی۔

ہمیں سرکار دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی سنت کو زندہ اور باقی رکھنا چاہیے اور الحمدللہ دونوں صورتوں میں سنت کا احیا اور تحفظ برقرار رہتا ہے۔

لیکن اگر عید گاہ پر بھی چھت ڈھال دی جائے اور اسے مثل مساجد کر دیا جائے تو یہ اوّلاً سنت نبوی و سنت سلف کے خلاف ہوگا۔ اور بعد میں ایک دوسرے کو دیکھ کر لوگ جب عید گاہوں پر چھت بنانا شروع کر دیں گے تو پھر یہ سنت کو مٹانے کے جیسا ہوگا جس کا حکم نسبتاً سخت ہے۔

جزئیات:

اب ہم کچھ فقہی جزئیات پیش کرتے ہیں جن سے یہ ثابت ہوگا کہ عید کی نماز کے لیے کھلے میدان میں نکلنا سنت ہے اور اسی پر تعامل سلف و خلف ہے۔

در مختار میں ہے: (وَالْخُرُوجُ إِلَيْهَا) أَيْ الْجَبَّانَةِ لِصَلَاةِ الْعِيدِ (سُنَّةٌ وَإِنْ وَسِعَهُمْ الْمَسْجِدُ الْجَامِعُ) هُوَ الصَّحِيحُ. (باب العیدین)

اس کے تحت رد المحتار میں ہے:

(قَوْلُهُ الْمُصَلَّى الْعَامُّ) أَيْ فِي الصَّحْرَاءِ۔

بَحْرٌ عَنْ الْمُغْرِبِ۔

(قَوْلُهُ وَالْوَاجِبُ مُطْلَقُ التَّوَجُّهِ) أَيْ لَا التَّوَجُّهُ الْمُتَرَتِّبُ عَلَى مَا ذُكِرَ وَلَا التَّوَجُّهُ الْمُقَيَّدُ بِالْمَشْيِ، وَلَا التَّوَجُّهُ إلَى خُصُوصِ الْجَبَّانَةِ، وَهَذَا تَكْمِلَةٌ الْجَوَابِ عَنْ السُّؤَالِ الْمُقَدَّرِ ۔

(قَوْلُهُ: هُوَ الصَّحِيحُ) قَالَ فِي الظَّهِيرِيَّةِ: وَقَالَ بَعْضُهُمْ: لَيْسَ بِسُنَّةٍ وَتَعَارَفَ النَّاسُ ذَلِكَ لِضِيقِ الْمَسْجِدِ وَكَثْرَةِ الزِّحَامِ وَالصَّحِيحُ هُوَ الْأَوَّلُ. اه

(رد المحتار، على الدر المختار ج 2 ص 269 ، كتاب الصلاة / باب العيدين ،مطبعة مصطفى البابي الحلبي بمصر)

فتاوی ہندیہ میں ہے:

الْخُرُوجُ إلَى الْجَبَّانَةِ فِي صَلَاةِ الْعِيدِ سُنَّةٌ وَإِنْ كَانَ يَسَعُهُمْ الْمَسْجِدُ الْجَامِعُ، عَلَى هَذَا عَامَّةُ الْمَشَايِخِ وَهُوَ الصَّحِيحُ، هَكَذَا فِي الْمُضْمَرَاتِ.

(الفتاوى الهندية ،ج 1 ص 150 ،كتاب الصلاة / الباب السابع عشر في صلاة العيدين المطبعة الكبرى الأميرية ببولاق مصر)

بحر الرائق میں ہے:

وَالْخُرُوجُ إلَى الْجَبَّانَةِ سُنَّةٌ لِصَلَاةِ الْعِيدِ، وَإِنْ كَانَ يَسَعُهُمْ الْمَسْجِدُ الْجَامِعُ عِنْدَ عَامَّةِ الْمَشَايِخِ هُوَ الصَّحِيحُ اهـ.

وَفِي الْمُغْرِبِ الْجَبَّانَةُ :الْمُصَلَّى الْعَامُّ فِي الصَّحْرَاءِ- التَّوَجُّهَ إلَى الْمُصَلَّى مَنْدُوبٌ كَمَا أَفَادَهُ فِي التَّجْنِيسِ، وَإِنْ كَانَتْ صَلَاةُ الْعِيدِ وَاجِبَةً حَتَّى لَوْ صَلَّى الْعِيدَ فِي الْجَامِعِ، وَلَمْ يَتَوَجَّهْ إلَى الْمُصَلَّى فَقَدْ تَرَكَ السُّنَّةَ، وَإِنَّمَا أُتِيَ بِثُمَّ لِإِفَادَةِ أَنَّ التَّوَجُّهَ مُتَرَاخٍ عَنْ جَمِيعِ الْأَفْعَالِ السَّابِقَةِ۔

(البحر الرائق شرح كنز الدقائق ج 2 ص 171 ،كتاب الصلاة / باب العيدين/ الخروج الى الجبانة، دار الكتاب الإسلامي)

ان تمام فقہی عبارات کا خلاصہ یہ ہے:

- نماز عید واجب ہے۔
- نماز عید کی ادائگی کے لیے کھلے میدان میں واقع عید گاہ میں جانا سنت ہے۔یہی صحیح ہے۔اور اسی پر عامہ مشائخ حنفیہ ہیں۔
- فقہ حنفی کی لغت مغرب میں ہے کہ جبانۃ سے مراد عام عید گاہ ہے جو صحرا یا کھلے میدان میں ہوتی ہے۔
- مسجد کی تنگی اور نمازیوں کی کثرت کی وجہ سے کھلے میدان میں جانے کی بات شوافع نے کی ہے جیسا کہ امام نووی شافعی رحمہ اللہ نے شرح مسلم میں اس کی صراحت فرمائی۔یہ ہم حنفیوں کا مذہب نہیں۔ہمارا مذہب یہی ہے کہ مسجد میں وسعت کے باوجود کھلے عید گاہ میں جانا سنت ہے لہذا حنفی اس کی پابندی کریں اور عید گاہ پر چھت بنانے سے بچیں۔

آگاہی: یہ حکم اس عید گاہ سے متعلق ہے جو نیا نیا مسلمان قائم کریں اور جو عید گاہ پہلے سے نماز عید کے لیے وقف ہے اس پر چھت بنانا تغییر وقف کی حیثیت سے ناجائز ہونا چاہیے۔

فتاوی ہندیہ میں ہے:

وَلَا يَجُوزُ تَغْيِيرُ الْوَقْفِ عَنْ هَيْئَتِهِ.(الفتاوى الهندية ج 2ص 490 ،كتاب الوقف الباب الرابع عشر في المتفرقات)

یہ لفظ اپنے اطلاق اور عموم کی وجہ سے قدیم عید گاہوں کے لیے بھی بظاہر اسی حکم کا افادہ کرتا ہے۔هذا ما عندی والعلم بالحق عند ربی وهو تعالیٰ اعلم.

■■■

فکر امروز

بے سوچے سمجھے فون کرنے والے ذرا توجہ دیں!

(فون کرنے کے آداب کو اجاگر کرتی ہوئی ایک تجزیاتی تحریر)

مولانا محمد عبد المبین نعمانی قادری

آج کل لوگوں کے ہاتھوں میں فون اور موبائل فون کی مشینیں آگئی ہیں، لوگ دھڑا دھڑ فون تو کرتے ہیں لیکن فون کے آداب کیا ہیں؟ طریقہ کیا ہے؟ اکثر لوگ اس کو نہیں جانتے، جس کی وجہ سے کچھ ان کا بھی وقت ضائع ہوتا ہے اور جن کو فون کیا ان کا بھی وقت برباد ہوتا ہے۔

ہوتا یہ ہے کہ فون لوگ کریں گے اور فوراً اپنی بات شروع کر دیں گے، یہ نہیں بتاتے کہ "میں کون ہو؟ کہاں سے بول رہا ہوں؟ کیا نام ہے؟ اور میری غرض وغایت کیا ہے؟ (جب کہ) ہونا یہی چاہیے کہ آدمی فون کرے تو فوراً بولے کہ "میں فلاں جگہ سے فلاں بن فلاں بول رہا ہوں، مجھے آپ سے یہ کام ہے،" تو سننے والے کو ان سوالوں کی ضرورت ہرگز نہیں پڑے گی کہ آپ کون ہیں؟ کہاں سے بول رہے ہیں؟ اکثر جب کسی کا فون آتا ہے تو جواب میں چہ جائے کہ ان کا مطلوب ان تک پہنچایا جائے آدمی سوال یہ کرتا ہے کہ آپ کہاں سے بول رہے ہیں؟ کون صاحب ہیں؟ بلاوجہ اُن کا اور جس کو فون کیا ہے اُس کا قیمتی وقت ضائع ہوجاتا ہے، لہٰذا جتنے فون کرنے والے ہیں ان کو فون کرنے کا اتنا ادب تو جاننا ہی چاہیے کہ پہلے اپنا نام اور پتا بتادیں پھر اپنا مدعا بیان کریں۔

اور جب ایسا نہیں کریں گے تو بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ جس کو فون کیا وہ فوراً فون رکھ دیتا ہے، اب اس کی کوئی کتنی ہی ضروری بات ہو وہ نہ سننے کو تیار ہے، نہ اس کو جواب مل پاتا ہے۔

قاعدے قانون کے تحت مناسب انداز سے فون کیا جائے تو جو فون کرنے والا ہے، سائل ہے یا طالب ہے اس کی طلب کو دوسرا آدمی سنے گا اور سوال کے جواب کے لیے وہ وقت دے گا اور جواب کی پوری کوشش کرے گا۔

اللہ تبارک و تعالیٰ مسلمانوں کو صحیح سمجھ عطا فرمائے، دوسرے لوگ (یعنی دوسرے مذہب کے ماننے والے) تو الگ ہیں، دوسرے لوگوں کا فون بھی بہت کم آتا ہے، مسلمانوں ہی کا زیادہ آتا ہے اور زیادہ تر یہی تماشا دیکھنے کو ملتا ہے، کہ فون آتے ہی بات شروع ہوجاتی ہے، سوال کرنے پر جواب دیتے ہیں اور بعض تو جواب بھی نہیں دیتے اپنی ہی بات کہے جاتے ہیں اور کتنے تو وہ ہیں کہ سلام تک نہیں کرتے اور بات شروع کر دیتے ہیں۔

مزے کی بات تو یہ ہے کہ سوال کرنے پر بھی "میں فلاں بول رہا ہوں" اتنا ہی بولیں گے، یہ نہیں کہ فلاں ہوں تو کہاں سے بول رہا ہوں، اگرچہ سوال بھی کیا جائے کہ آپ کون صاحب ہیں، کہاں سے بول رہے ہیں پھر بھی جواب میں صرف "میں فلاں بول رہا ہوں" اتنا ہی بولتے ہیں اور اگر کچھ کہا تو اتنا کہا کہ مثلاً بہار سے بول رہا ہوں، گجرات سے بول رہا ہوں، ظاہر ہے صرف بہار یا گجرات بولنے سے بھی جگہ متعیّن نہیں ہوتی، شہر یا گاوں کا نام بولنا چاہیے۔ چوں کہ بالعموم جن کو فون کیا جاتا ہے، وہ مخاطب کی آواز سے آشنا نہیں ہوتے ہیں۔

ہاں! جن کا بار بار فون آتا ہے ان کے نام اور ان کی آواز سے آدمی واقف ہوتا ہے تو سوال بھی کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی، لہٰذا ہمیں اس کا لحاظ کرنا بہت ضروری ہے، ہم ایسا نہیں کریں گے تو یہ ہماری نادانی کی دلیل ہوگی اور اس بات کی بھی دلیل ہوگی کہ نہ تو ہم آداب گفتگو جانتے ہیں، نہ آداب زندگی سے واقف ہیں، نہ ہی فون کرنے کے آداب سے۔

یوں ہی بہت سے لوگ بے سوچے سمجھے فون پر اپنی عورتوں کو طلاق دے کر افسوس کرتے ہیں کچھ تو یہ سوچتے ہیں کہ میں نے فون پر طلاق دی ہے۔ یہ طلاق نہیں مانی جائے گی۔ حالاں کہ فون پر بھی طلاق واقع ہوجاتی ہے اور بعض تو طلاق دے کر انکار کر دیتے ہیں سوچتے ہیں کہ کوئی گواہ تو ہے نہیں، اس

بانی رکن المجمع الاسلامی مبارک پور اعظم گڑھ

لیے جھوٹ بول کر اپنی بات بنالیں گے، یہ بات بنانا نہیں اور بگاڑنا ہے۔ گواہ نہیں ہے جب بھی طلاق ہوجاتی ہے۔ البتہ ثبوت نہیں ملتا لہٰذا ثبوت نہ ملنا یا گواہ نہ ہونا طلاق کو ختم نہیں کر سکتا۔

موبائل فون سے کیے جانے والے کچھ اچھے کام:

- موبائل کے ذریعے اپنے احباب کو دین کی دعوت دینا اور نماز کے لیے اٹھانا بڑے ہی ثواب کا کام ہے کہ "الدال علی الخیر کفاعلہ"، "نیکی کا راستہ بتانے والے کو بھی اس نیکی کا ثواب ملتا ہے۔ (حدیث)
- فون کے ذریعے امر بالمعروف (نیکیوں کا حکم دینا) نہی عن المنکر (گناہ کے کاموں سے منع کرنا) بھی ایک بڑی نیکی اور ثواب کا کام ہے اس کو بھی انجام دیا جاسکتا ہے۔
- دیگر شرعی احکام کی ترسیل کا کام بھی فون سے لیا جاسکتا ہے۔
- دینی اجتماعات کی اطلاع اور دعوتِ شرکت بھی ایک بڑا ہی اہم دینی کام ہے اور موجب ثواب بھی۔ یہ کام بھی اس سے لیا جاسکتا ہے۔
- نئی دینی کتابوں کی اطلاع بھی احباب کو دی جاسکتی ہے اور انھیں دعوت مطالعہ بھی۔ فون کے ذریعے یہ کام بھی کرنے کی کوشش کی جانی چاہیے۔
- فون کے ذریعے معاشرے میں پھیلی ہوئی غلط رسموں کے خلاف بھی تحریک چلائی جاسکتی ہے۔
- یوں ہی پوچھنے پر کہ کہاں سے بول رہے ہیں تو جھٹ بول دیتے ہیں "میں آپ کا شاگرد یا دوست بول رہا ہوں آپ نے پہچانا نہیں؟" جب کہ ہزاروں عقیدت مندوں اور شاگردوں میں کسی کو دیکھ کر بھی پہچاننا مشکل ہوتا ہے تو صرف "میں آپ کا دوست/شاگرد بول رہا ہوں" کیا معنی رکھتا ہے، لہٰذا یہاں بھی پوری بات بتانی چاہیے۔
- میری اپنے اسلامی بھائیوں سے گزارش ہے کہ اس طرح کی بے وقوفی کا ثبوت نہ دیا کریں تو بہتر ہے، یہ سب غلطیاں زیادہ تر وہ لوگ کرتے ہیں جو وقت کی قیمت سے بالکل واقف نہیں، نہ آداب گفتگو ہی جانتے ہیں۔
- اسی طرح نماز کے وقت فون آتے ہیں، لوگ گیارہ، بارہ بجے رات میں گھنٹیاں بجاتے ہیں اور کوئی حادثاتی خبر بھی نہیں ہوتی، یوں ہی یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ جس کو فون کیا جارہا ہے وہ کتنی دوری پر ہے، وہاں ڈیوٹی اور نماز کے اوقات کیا ہوں گے، یہ بھی سوچنا سمجھنا ضروری ہے۔
- اسی طرح کوئی ٹیچر ہے اور تدریس سے جڑا ہے تو اس کے اوقات کا بھی فون کرنے والے کو لحاظ کرنا ضروری ہے۔

یہ چند اشارے ہیں ان کو سامنے رکھ کر ہم فون کریں تو بہت سی خرابیوں سے بچ سکتے ہیں۔ ▪

(ص: 24 کا بقیہ)۔ قسطنطنیہ پر تینوں حملوں میں سے کسی بھی حملے میں یزید کی شرکت ثابت نہیں ہوتی، پھر سوال ہوتا ہے کہ یزید قسطنطنیہ کی کس جنگ میں شامل تھا، تو اس کے متعلق چار اقوال ملتے ہیں:

1- سن 49 ہجری میں روم کے معرکہ میں شریک رہا جس کا ثبوت البدایہ والنہایہ سے ملتا ہے کہ سن 49 ہجری میں یزید بن معاویہ نے مملکت روم پر حملہ کیا یہاں تک کہ قسطنطنیہ تک پہنچ گیا۔

2- یزید 50 ہجری کے معرکہ میں شریک رہا جس کی توضیح عمدۃ القاری کی جلد 5 میں موجود ہے کہ "50 ہجری کو مسلمان اس لشکر میں قسطنطنیہ تک پہنچے اور اس کا محاصرہ کیا جب کہ یزید بن معاویہ اپنے والد کی جانب سے اس لشکر کا سپہ سالار تھا۔

3- 52 ہجری کے حملے میں یزید شریک تھا اور اس قول کو حضرت علامہ بدر الدین عینی حنفی رحمۃ اللہ علیہ نے ترجیح دی ہے جو کہ عمدۃ القاری میں مذکور ہے۔

4- حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے 55 ہجری میں قسطنطنیہ پر لشکر کشی کے لیے یزید کو روانہ کیا جیسا کہ "الاصابة في معرفة الصحابة" میں موجود ہے۔

(ماخوذ: حقانیت امام حسین اور حدیث قسطنطنیہ)

لہٰذا ان چاروں اقوال میں سے کسی ایک قول کو بھی مان لیا جائے تو یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یزید "مغفور لهم" جیسی عظیم بشارت میں شامل ہے، کیوں کہ ان چار حملوں سے پہلے بھی متعدد مرتبہ قسطنطنیہ پر حملے ہو چکے تھے۔ لہٰذا بغیر کسی تحقیق و تفتیش اور ثبوت کے یزید کو اس بشارت کا مصداق ٹھہرانا سراسر کذب ہے۔ ▪

فکرامروز

عالَم کے قدیم ہونے کا فلسفی نظریہ

اور شیخ ابن تیمیہ کی ہم نوائی

مفتی محمد فیضان سرور مصباحی

"أَوَّلَ" [اولیت مطلقہ، ازلی، قدیم] اللہ تعالی کی صفت خاصہ ہے، قرآن پاک میں ہے:

«هُوَ الْاَوَّلُ وَ الْاٰخِرُ» (الحدید:3) وہی اول ہے، اپنی ذات وصفات میں وہی سب سے پہلے ہے، اس پہلے کوئی وجود نہیں۔ اور یہ اول ہونا، پہلا ہونا کسی ابتدا و آغاز سے پاک ہے۔

حدیث میں ہے: «كَانَ اللهُ وَلَمْ يَكُنْ شَيْءٌ غَيْرَهُ» (رواہ البخاری)

اللہ تعالیٰ تھا جب کہ اللہ کے علاوہ کوئی اور شے نہیں تھی۔

قرآن پاک میں ہے:

قُلِ اللّٰهُ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ. (یونس:34)

کہہ دو! اللہ ہی ہے، جو مخلوق کو پہلی بار پیدا فرماتا ہے۔ پھر وہی اسے دوبارہ بنائے گا۔

توضیح: مخلوق کی ابتدا جب اللہ تعالیٰ نے کی ہے تو پھر مخلوق کے لیے "بَعدیت" ثابت ہوگی "اولیت" نہیں؛ کیوں کہ خالق پہلے ہوتا ہے اور مخلوق بعد میں۔ پھر اسی دلیل سے خالق و مخلوق کا ازلاً ساتھ ساتھ ہونا بھی باطل ہوا۔

خالق و مخلوق کے درمیان ایک بڑا فرق اسی صفت "اولیت" سے ہوتا ہے، اسی کو "ازلی" کہا جاتا ہے، اور اسی کو "اولیت مطلقہ" اور "قدیم" کا نام دیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کو "ازلی، "قدیم" اور "صاحبِ اولیت مطلقہ" سمجھنا شرک ہے۔ اور یہ اقسامِ شرک میں سے شرک فی الذات ہے۔

ہاں "اولیت نسبیہ" یعنی مخلوق کا آپس میں کسی شے کی طرف نسبت کرتے ہوئے کہنا درست ہوگا، مثلاً: نوارانیت مصطفیٰ ﷺ کی اولیت دیگر مخلوقات کی طرف نسبت کرتے ہوئے اسی طرح پانی کی اولیت، عرش کی اولیت مابعد مخلوق کی طرف نسبت کرتے ہوئے وغیرہ۔

اولیت مطلقہ اور اولیت نسبیہ کے درمیان فرق جاننے کے بعد آئیے اس کی تفصیلات جانب متوجہ ہوتے ہیں۔

عالم (کائنات) کے قدیم ہونے کے فلسفیانہ نظریے کا شرعی وعقلی رد:

اسلامی عقیدہ یہ ہے کہ یہ پوری کائنات، علوی (آسمانی) ہو یا سفلی (زمینی)، اس کی تمام ذاتی اشیا (جواہر) اور صفاتی اشیا (اعراض) حادث ہیں یعنی پیدا کی گئی ہیں۔ اس کے برخلاف بعض فلاسفہ، خصوصاً فارابی اور ابن سینا جیسے مشائی فلسفی کہتے ہیں:

"یہ عالم قدیم ہے، یعنی ہمیشہ سے ہے، اس کی نہ کوئی ابتدا ہے اور نہ ہی اسے کسی نے پیدا کیا۔"

بعض نے یہ کہہ کر درمیانی راہ نکالنے کی کوشش کی:

"اس کی مادہ (اصل عنصر) قدیم ہے، مگر اس کی صورت (ترکیب یا شکل) حادث ہے۔"

یہ نظریہ قرآن و سنت، اجماعِ امت اور عقلِ صحیحہ کے خلاف ہے۔ اس کا رد درج ذیل انداز سے کیا جاتا ہے:

فلسفیانہ نظریے کا رد قرآن کی روشنی میں:

اللہ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ (الزمر:62) اللہ ہر چیز کا خالق ہے۔

■ یہ آیت عام ہے اور ہر مخلوق کو شامل ہے، لہٰذا کوئی چیز

قدیم نہیں ہو سکتی۔

هُوَ ٱلَّذِي خَلَقَ ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلۡأَرۡضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ.

(الحدید:4)

وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں پیدا فرمایا۔

◘ اس سے ظاہر ہوا کہ آسمان و زمین (یعنی پوری کائنات) کا خالق اللہ ہے، اور یہ پہلے موجود نہ تھے۔

كُنۡ فَيَكُونُ. (یٰسٓ:۸۲) (ہو جا، پس وہ ہو جاتا ہے۔)

◘ اس اسلوب سے بتایا گیا کہ اللہ تعالی چیزوں کو عدم سے وجود میں لاتا ہے، چیزیں اپنے وجود میں ارادۂ الٰہی کی محتاج ہیں، یعنی وہ حادث ہوتی ہیں، قدیم نہیں۔

فلسفیانہ نظریے کا رد احادیث کی روشنی میں:

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«كَانَ اللهُ وَلَمْ يَكُنْ شَيْءٌ غَيْرَهُ» -(رواہ البخاری)

ترجمہ: اللہ تھا اور اس کے سوا کچھ نہ تھا۔

◘ اس حدیث سے صاف پتہ چلتا ہے کہ عالم، اللہ کے ساتھ، پہلے موجود نہ تھا۔

فلسفیانہ نظریے کا رد عقلی استدلال کی روشنی میں:

(1)-قدیم اور واجب الوجود صرف ایک ہو سکتا ہے:

اگر عالم بھی قدیم ہو، تو وہ بھی واجب الوجود مانا جائے گا، اور واجب الوجود دو نہیں ہو سکتے، کیونکہ پھر دونوں میں فرق ہو گا، اور فرق امکان پر دلالت کرے گا، جو وجوب کے خلاف ہے۔

(2)-ہر مرکب محتاج ہوتا ہے:

عالم ایک مرکب چیز ہے، مختلف اجزاء، عناصر، اوقات اور مقامات پر مشتمل ہے، اور مرکب چیز کو ترکیب دینے والا چاہیے، یعنی وہ خود بخود نہیں ہو سکتا۔ اور محتاج قدیم نہیں ہو سکتا۔

(3)-عالم میں تبدیلی واقع ہوتی ہے:

عالم ہمیشہ تغیر، زوال، حرکت، فساد، وانحلال کے مراحل سے گزرتا ہے، اور تغیر، حادث ہونے کی سب سے بڑی علامت ہے۔ جب کہ قدیم چیز میں تبدیلی ممکن نہیں، کیوں کہ وہ زمانے سے بالاتر ہوتی ہے۔

(4)-تسلسل لامتناہی (نہ ختم ہونے والا سلسلہ) کا بطلان:

اگر عالم قدیم ہو اور اس کی کوئی ابتدا نہ ہو، تو لازم آتا ہے کہ حوادث کا ایک لامتناہی سلسلہ ہو، جو کہ محال عقلی ہے، کیوں کہ اگر ماضی میں کسی حادث کی ابتدا ہی نہ ہوئی ہو، تو موجودہ حال میں کوئی چیز وجود پذیر نہیں ہو سکتی۔ جب یہ کہ عقلاً و مشاہدتاً باطل ہے۔

فلاسفہ کے دونوں اقوال کا تجزیہ اور شرعی محاکمہ:

الف: "قديم بمادته وصورته."

◘ یہ تو سراسر کفر کے مترادف ہے، کیوں کہ اس میں اللہ کی صفتِ خالقیّت کا انکار لازم آتا ہے۔

◘ اور اللہ کو عالم کا موجد (پیدا کرنے والا) ماننے کے بجائے صرف ایک سبب تسلیم کیا جاتا ہے۔

ب: "قديم المادة محدث الصورة."

◘ یہ بھی غلط ہے، کیوں کہ مادہ بھی ایک مخلوق ہے۔ کسی بھی شے کی مادہ کو قدیم ماننا بھی شرعی نصوص کے خلاف ہے، اور یہ لازم کرتا ہے کہ اللہ سے پہلے بھی، یا ساتھ ساتھ کچھ موجود تھا۔

نتیجہ: اسلامی عقیدہ یہ ہے کہ — اللہ تعالیٰ کے سوا سب کچھ حادث ہے، یعنی اللہ نے اسے عدم سے پیدا کیا ہے۔

اور جو بھی عالم (ماسوی اللہ) کو قدیم مانے، وہ ● اللہ تعالیٰ کی خالقیّت کا انکار کرتا ہے۔ ● عقل کے اصول کو توڑتا ہے۔ ● قرآن و حدیث اور اجماعِ امت کا منکر ہوتا ہے۔

لہٰذا فلاسفہ کا نظریہ باطل، مردود ہے، اسی لیے متکلّمین، محدثین اور فقہاے کرام نے کہا کہ واجب الوجود، ازلی اور قدیم صرف اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ذات ہے۔ اور عالم (ماسوی اللہ) یا کسی شئ، یا اس کے مادہ کو قدیم و ازلی بتانا کفر ہے۔

مشہور محدث و اصولی علامہ بدر الدین عبد اللہ الزرکشی (ت ۷۹۴ھ) لکھتے ہیں:

وهذا العالم بجملته علويه وسفليه جواهره وأعراضه - محدث، أي: بمادته وصورته، كان عدما فصار موجودا وعليه إجماع أهل الملل ولم يخالف إلا الفلاسفة ومنهم: الفارابي، وابن سينا قالوا: إنه قديم بمادته وصورته. وقيل: قديم المادة محدث الصورة.

ترجمہ: یہ پوری دنیا، عالم علوی ہو کہ سفلی (اوپر کی ہو یا نیچے کی) اس کی تمام جواہر (ذاتی اشیا) اور اعراض (صفات وحالاتی چیزیں) حادث ہے، یعنی اپنی مادہ اور صورت دونوں کے اعتبار سے نئی پیدا کی گئی ہے، پہلے یہ معدوم (غیر موجود) تھی، پھر موجود ہوئی۔

اور اس پر تمام اہلِ مذاہب کا اجماع ہے، اس کے خلاف صرف فلاسفہ نے کیا ہے، جن میں فارابی اور ابن سینا شامل ہیں۔

انھوں نے کہا: یہ عالم اپنی مادہ اور صورت دونوں کے اعتبار سے قدیم (ہمیشہ سے موجود) ہے۔

اور ایک قول یہ بھی ہے کہ: اس کی مادہ قدیم ہے، مگر صورت حادث ہے۔"

آگے مزید نقلِ اقوال کے بعد لکھتے ہیں:

... وكل هذه الأقوال باطلة، وقد ضللهم المسلمون في ذلك وكفروهم.

ترجمہ: "اور یہ تمام اقوال باطل ہیں، مسلمانوں نے ان کے قائلین کو اس بارے میں گمراہ قرار دیا ہے اور ان پر کفر کا حکم جاری کیا ہے۔" (تشنیف المسامع بجمع الجوامع، ۴/۶۳۱-۶۳۳، الکتاب السابع: فی الاجتہاد، الناشر: مکتبۃ قرطبۃ-الطبعۃ: الأولی، ۱۴۱۸ھ-۱۹۹۸م)

وہابی پیشوا اللہ تعالیٰ کے ساتھ نوع حوادث کو بھی قدیم مانتے ہیں:

مقام افسوس یہ ہے کہ وہابیوں کے فکری پیشوا شیخ ابن تیمیہ حرانی بھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ نوع حوادث کو قدیم مانتے ہیں، اور ان کے ازلی، اور لا أوّلیت کے قائل ہیں۔ اور یہ کہتے ہیں کہ نوعِ عالم ازلی وقدیم ہے، اور اس کے افراد حادث ہیں۔ اسی طرح یہ بھی کہا کہ جنس عرش قدیم ہے۔ نعوذ باللہ

وَحِينَئِذٍ فَيُمْتَنَعُ كَوْنُ شَيْءٍ مِنَ الْعَالَمِ أَزَلِيًّا، وَإِنَّ جَازَ أَنْ يَكُونَ نَوْعُ الْحَوَادِثِ دَائِمًا لَمْ يَزَلْ، فَإِنَّ الْأَزَلَ لَيْسَ هُوَ عِبَارَةً عَنْ شَيْءٍ مُحَدَّدٍ، بَلْ مَا مِنْ وَقْتٍ يُقَدَّرُ إِلَّا وَقَبْلَهُ وَقْتٌ آخَرُ، فَلَا يَلْزَمُ مِنْ دَوَامِ النَّوْعِ قِدَمُ شَيْءٍ بِعَيْنِهِ.

اور اس وقت عالم کی کوئی چیز کا ازلی ہونا محال قرار پائے گا، اگرچہ یہ ممکن ہے کہ نوعِ حوادث ہمیشہ سے ہو، اور اس پر کبھی زوال وعدم طاری نہ ہوئی ہو، کیونکہ "ازل" کسی معین چیز کا نام نہیں ہے، بلکہ جس وقت کو مانیں گے، اس سے پہلے ایک دوسرا وقت بھی موجود ہوگا۔ لہٰذا نوع کے دوام (قدیم وازلی ہونے) سے یہ لازم نہیں آتا کہ کوئی مخصوص فرد قدیم (بلا ابتداء) ہو۔ (منہاج السنۃ النبویۃ ۱/۳۹۰، الاستطراد فی الرد علی قول الفلاسفۃ بقدم العالم، الناشر: جامعۃ محمد بن سعود الاسلامیۃ، الطبعۃ الأولی، ۱۴۰۶ھ-۱۹۸۶م)

اس کی تفصیل جاننے سے قبل یہ جان لینا چاہیے کہ شیخ ابن تیمیہ اس کی تفصیل کرتے ہیں اور یہ تقسیم ان کی ذہنی اختراع نہیں ہے، بلکہ خود فلاسفہ ملحدین کے یہاں یہ تقسیم ملتی ہے، چنانچہ وہ سمجھاتے ہیں:

ایک ہے: قدیم نوعی: یعنی وہ حوادث اپنے نوع کے اعتبار سے قدیم وازلی ہیں۔ جیسے: اللہ تعالیٰ قدیم وازلی۔

دوسرا ہے: حادث یومی: یعنی وہ نوع اپنے افراد وآحاد کے اعتبار سے حادث ہے۔ نوع کے افراد جو بعد میں وجود پذیر ہوئے وہ حادث ہے۔

یہ نظریہ ان کی مطبوعہ کتب میں سے: بیان موافقة صريح المعقول لصحيح المنقول، درء تعارض العقل والنقل، منهاج السنة النبوية، كتاب شرح حديث النزول، كتاب شرح حديث عمران بن حصين، كتاب نقد مراتب الإجماع، مجموعة تفسير

من ست سور اور مجموعة الفتاوی میں درج ہیں۔

شیخ ابن تیمیہ کی کتب سے چند اقتباسات ملاحظہ فرمائیں:

قوله: لو كانت حادثة في الأزل لكان الحادث اليومي موقوفًا على انقضاء ما لا نهاية له.

قلنا: لا نسلم، بل يكون الحادث اليومي مسبوقًا بحوادث لا أول لها، ولم قلتم: إن ذلك غير جائز؟ .

قلت: مضمونة أنه يكون موقوفا على انقضاء ما لا ابتداء له، ولا أول له، وهو لا نهاية له من الطرف الأول، لكن له نهاية من الطرف الآخر.

شیخ ابہری کا قول ہے: "اگر (حادثات) ازل میں واقع ہوتے، تو روزانہ کا حادثہ ایسے سلسلے پر موقوف ہوتا جس کی کوئی انتہانہ ہو۔"

اس پر ہم کہیں گے: ہم اس کو تسلیم نہیں کرتے، بلکہ روزانہ کا حادثہ ان حوادث کے بعد واقع ہوتا ہے جن کی کوئی ابتدا نہیں۔ اور آپ نے کس دلیل سے کہا کہ یہ جائز نہیں؟

میں (ابن تیمیہ) کہتا ہوں: اس کا مفہوم یہ ہے کہ یہ (یعنی روزانہ کا حادثہ) ایسے سلسلے پر موقوف ہو جاتا ہے جس کی نہ کوئی ابتداء ہو اور نہ ہی کوئی پہلا واقعہ ہو، یعنی جس کی کوئی ابتدا نہیں، گویا وہ سلسلہ ایک طرف سے لانہایت ہے، لیکن دوسری طرف سے اس کی ایک انتہا ہے۔ (درء تعارض العقل والنقل ۱/۳۸۹، رد الأبهري على الرازي وتعليق ابن تيمية، الناشر: جامعة محمد بن سعود، السعودية، الطبعة الثانية: ۱۴۱۱ھ-۱۹۹۱م)

اسی کتاب میں ایک جگہ لکھا ہے:

وأين في القرآن امتناع حوادث لا أول لها ؟

یعنی: قرآن پاک میں کہاں یہ ہے کہ ایسے حوادث - جن کی کوئی ابتدا نہ ہو - کا وجود محال ہے۔

(درء تعارض العقل والنقل ۱/۱۱۸، بتفصیل سابق)

اپنی کتاب "منہاج السنۃ" میں لکھا:

فَإِنْ قُلْتُمْ لَنَا: قَدْ قُلْتُمْ بِقِيَامِ الْحَوَادِثِ بِالرَّبِّ. قُلْنا لَكُمْ : نَعَمْ، وَهَذَا قَوْلُنَا الَّذِي دَلَّ عَلَيْهِ الشَّرْعُ وَالْعَقْلُ...

ترجمہ: پھر اگر تم ہم سے کہو: تم تو یہ قول کر چکے ہو کہ حوادث (یعنی مخلوقات یا نئے واقعات) رب (اللہ تعالیٰ) کے ساتھ قائم ہیں۔

تو ہم تم سے کہیں گے: ہاں، یہی ہمارا قول ہے، اور یہی وہ بات ہے جس پر شریعت اور عقل دونوں دلالت کرتے ہیں۔

(منہاج السنۃ النبویۃ ۲/۳۸۰ — ابن تیمیۃ (ت ۷۲۸) الناشر: جامعۃ الإمام محمد بن سعود الاسلامیۃ، الطبعۃ الأولی، ۱۴۰۶ھ-۱۹۸۶م)

شیخ ابن تیمیہ کی خوبی یہ ہے کہ بڑی صفائی سے اپنی من چاہی باتوں کو شرع کے موافق بتا کر نکل جاتے ہیں، تاکہ کم سمجھ رکھنے والوں والے پر اپنی بات کا دبدبہ قائم کر سکیں۔ جیسا کہ گزشتہ عبارت میں "وَهَذَا قَوْلُنَا الَّذِي دَلَّ عَلَيْهِ الشَّرْعُ وَالْعَقْلُ" لکھ کر اسی چالاکی کا مظاہرہ کیا۔

حالاں کہ "قيام الحوادث بالرب، لاأول لها" کا نظریہ اسلام و شریعت کے بر خلاف خالص فلسفیانہ نظریہ ہے، اور اس معاملے میں شیخ نے فلاسفہ سے متاثر کر انھی کی پیروی کی ہے۔ اسی لیے علما و محدثین اور اسلامی محققین نے اس پر شیخ ابن تیمیہ پر سخت نقد کیا ہے۔ اور بدترین عقیدہ سازی کا کام کہا ہے۔

وہابیوں کے ایک اور فکری پیشوا شیخ ابن حزم نے یہ لکھا ہے کہ جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی اور کو ازلی مانے وہ باتفاق مسلمین کافر ہے۔ ان کی عبارت ملاحظہ کریں:

بَاب من الإجماع فِي الاعتقادات يكفر من خَالفه باجماع.

اتَّفقُوا ان الله وَحده لَا شريك لَهُ، خَالق كل شَيْء غَيره، وَأَنه تَعَالَى لم يزل وَحده، وَلَا شَيْء غَيره مَعَه، ثمَّ خلق الأشياء كلهَا كَمَا شَاءَ.

ترجمہ: باب: اعتقادی امور میں اجماع کا بیان — جس کی مخالفت کرنے والا اجماعاً کافر قرار دیا جاتا ہے۔

اہلِ اسلام اس بات پر متفق ہیں کہ اللہ تعالیٰ یکتا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں، وہ اپنے سوا ہر چیز کا خالق ہے، اور بے شک وہ ہمیشہ سے اکیلا تھا، اس کے ساتھ کوئی چیز نہ تھی، پھر اس نے تمام چیزوں کو جیسے چاہا پیدا فرمایا۔ (مراتب الإجماع ۱/۱۶۷ — ابن حزم (ت ۴۵۶) باب من الإجماع فی الاعتقادات یکفر من خالفہ باجماع، الناشر: دار الکتب العلمیۃ- بیروت-)

امام الشان محدث ابن حجر عسقلانی (م ۸۵۲ ھ) رحمۃ اللہ علیہ نے بھی عالم کے قدیم ہونے کے قائل پر حکم کفر نقل کیا ہے، اور متعدّد علمائے اسلام کے ذریعے اس پر اجماع نقل فرمایا ہے، وہ لکھتے ہیں:

قَالَ شَيْخُنَا - العراقي - فِي شَرْحِ التِّرْمِذِيِّ : الصَّحِيحُ فِي تَكْفِيرِ مُنْكِرِ الْإِجْمَاعِ تَقْيِيدُهُ بِإِنْكَارِ مَا يُعْلَمُ وُجُوبُهُ مِنَ الدِّينِ بِالضَّرُورَةِ، كَالصَّلَوَاتِ الْخَمْسِ.

وَمِنْهُمْ: مَنْ عَبَّرَ بِإِنْكَارِ مَا عُلِمَ وُجُوبُهُ بِالتَّوَاتُرِ.

وَمِنْهُ : الْقَوْلُ بِحُدُوثِ الْعَالَمِ.

وَقَدْ حَكَى عِيَاضٌ وَغَيْرُهُ: الْإِجْمَاعَ عَلَى تَكْفِيرِ مَنْ يَقُول بقدم الْعَالم.

وَقَالَ بن دَقِيقِ الْعِيدِ :

وَقَعَ هُنَا مَنْ يَدَّعِي الْحِذْقَ فِي الْمَعْقُولَاتِ، وَيَمِيلُ إِلَى الْفَلْسَفَةِ، فَظَنَّ أَنَّ" الْمُخَالِفَ فِي حُدُوثِ الْعَالَمِ لَا يُكَفَّرُ" لِأَنَّهُ مِنْ قَبِيلِ مُخَالَفَةِ الْإِجْمَاعِ، وَتَمَسَّكَ بِقَوْلِنَا :" إِنَّ مُنْكِرَ الْإِجْمَاعِ لَا يُكَفَّرُ عَلَى الْإِطْلَاقِ." حَتَّى يَثْبُتَ النَّقْلُ بِذَلِكَ مُتَوَاتِرًا عَنْ صَاحِبِ الشَّرْعِ .

قَالَ: وَهُوَ تَمَسُّكٌ سَاقِطٌ إِمَّا عَنْ عَمًى فِي الْبَصِيرَةِ، أَوْ تَعَامٍ لِأَنَّ حُدُوثَ الْعَالَمِ مِنْ قَبِيلِ مَا اجْتَمَعَ فِيهِ الْإِجْمَاعُ وَالتَّوَاتُرُ بِالنَّقْلِ .

ترجمہ: "ہمارے شیخ — امام عراقی — نے شرح ترمذی میں فرمایا: صحیح بات یہ ہے کہ اجماع کے انکار پر تکفیر کا حکم اس وقت لگے گا جب اس چیز کا انکار کیا جائے جس کا واجب ہونا دین میں ضروری طور پر معلوم ہو، جیسے پانچ نمازیں۔

اور بعض علما نے یوں تعبیر کیا ہے کہ اس چیز کے انکار پر کفر لازم آتا ہے جس کا وجوب متواتر طریقے سے معلوم ہو۔

اور انھی میں سے ہے: عالم کے حادث ہونے کا قول۔

قاضی عیاض اور دیگر نے اس پر اجماع نقل کیا ہے کہ جو شخص عالم کے قدیم ہونے کا قائل ہو، وہ کافر ہے۔

محدث ابن دقیق العید نے فرمایا:

یہاں بعض وہ لوگ وارد ہوئے جو عقلیات میں مہارت کا دعویٰ کرتے ہیں اور فلسفہ کی طرف مائل ہیں، تو انھوں نے یہ گمان کیا کہ "عالم کے حادث ہونے کا مخالف کافر نہیں ہوتا" کیونکہ یہ اجماع کی مخالفت کی ایک قسم ہے۔

اور انھوں نے ہمارے اس قول کو پکڑا کہ: "اجماع کا منکر مطلقاً کافر نہیں ہوتا، جب تک کہ اس پر صاحبِ شریعت (یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف سے متواتر نقل ثابت نہ ہو۔"

انھوں (ابن دقیق العید) نے فرمایا:

یہ ایک باطل استدلال ہے، یا تو بصیرت کی نابینائی کی وجہ سے ہے، یا جان بوجھ کر آنکھیں بند کرنے کی وجہ سے، کیوں کہ عالم کے حادث ہونے کے مسئلے پر اجماع بھی قائم ہے اور نقلِ متواتر بھی۔"

(فتح الباری لابن حجر ۱۲/۲۰۲ — جزء ۱۲، قولہ: باب قول اللہ تعالیٰ: اَن النفس بالنفس والعین بالعین، الناشر: دار المعرفۃ- بیروت، ۱۳۷۹)

جب یہ نظریہ قرآن، حدیث صریح، اجماع امت اور عقلی قضایا کے خلاف ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے سوا، کسی بھی طرح عالم کو قدیم ماننا کفر ہے تو اسی سے اس نظریے کی سنگینی واضح ہو جاتی ہے۔

دراصل یہ شیخ ابن تیمیہ کے فلسفیانہ مباحث سے متاثر ہونے کا نتیجہ ہے، اور باب عقائد میں ان کی بڑی سنگین لغزش ہے، جس پر اس دور کے علماء نے بھی اور بعد میں بھی تنبیہ و تردید کی۔ اور فرمایا کہ یہ فلسفی نظریہ خلاف اجماع ہے۔ اور اس کے قائل کی تکفیر کی جائے گی۔ ■■■

شعاعیں

مطالعۂ سیرت - کیوں اور کیسے ؟

آفتاب رشکِ مصباحی

حضور خاتم المرسلین ﷺ کی ولادت سے پردہ فرمانے تک کے تمام احوال و کوائف، عادات و اطوار، گفتار و کردار اور معمولات حیات کے تمام پہلوؤں کا احاطہ سیرت کہلاتا ہے۔ حضور علیہ السلام اللہ کے آخری پیغمبر، محبوب رسول اور منتخب نبی ہیں۔ آپ کی سیرت سب سے جامع، مکمل، واضح اور بہتر ہے۔ سیرت کی پاکیزگی اور اخلاق کی بلندی ایسی کہ نام کی جگہ لوگ آپ کو "الامین" اور ''الصادق'' کے الفاظ سے یاد کیا کرتے تھے۔ اور آپ کے حسن اخلاق کی گواہی اس سے بڑھ کر کیا ہوگی کہ آپ کا خالق آپ کی شان میں "انک لعلیٰ خلق عظیم" فرماتا ہے۔ اور آپ کی زوجہ ام المومنین سیدہ عایشہ صدیقہ سلام اللہ علیہا ''کان خلقه القرآن'' کہہ کر اپنے شب و روز کا مشاہدہ پیش کرتی ہیں۔

سیرت رسول کا مطالعہ کیوں کریں؟

دیکھیے! انسان ایک معاشرتی مخلوق ہے۔ وہ انسانوں کے درمیان زندگی گزارتا ہے جہاں اس کے ایک دوسرے سے مختلف تعلقات و معاملات ہوتے ہیں۔ اور خود ایک انسان پر دنیوی اعتبار سے مختلف احوال و ادوار کا اثر پڑتا ہے۔ اسی کے ساتھ انسان کا ایک رشتہ اس کے خالق و مالک اللہ سبحانہ و تعالیٰ سے بھی ہے۔ ان تمام چیزوں کو ایک ساتھ انسان کیسے مینج کرے۔ کب، کہاں، کس طرح کی صورت اختیار کرے۔ کس کے ساتھ کیسا تعلق اور معاملہ کرے۔ ان تمام چیزوں کے لیے صرف اصول کافی نہیں ہوتے، بلکہ عملی نمونے کی ضرورت پڑتی ہے اور وہ عملی نمونہ رسول کائنات ﷺ کی حیات طیبہ سے ملتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَن كَانَ يَرْجُو اللَّهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَذَكَرَ اللَّهَ كَثِيرًا''۔ (الاحزاب-۲۱) جو شخص اللہ سے ملنے اور قیامت کے دن پر یقین رکھتے ہوئے اللہ کو کثرت سے یاد کرتا ہے ایسے لوگوں کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی بہترین نمونۂ عمل ہے۔

اگر آپ اپنی زندگی کو عدل و انصاف اور اعتدال و توازن کے ساتھ گزارنا چاہتے ہیں جن میں آپ کا تعلق خالق سے بھی مضبوط و مستحکم رہے اور انسانی افراد سے بھی بہتر اور متناسب رہے تو ان تمام کے لیے رسول کریم علیہ الصلواۃ والتسلیم کی زندگی ہی آپ کی بہتر رہ نمائی کر سکتی ہے۔ کیوں کہ رسول اللہ صص کی کتاب حیات کا ہر ایک ورق تاریخی شواہد، مضبوط و مسلّم گواہان کے ساتھ بصورت تسلسل روشن و واضح ہے۔

سیرت رسول کا مطالعہ کیسے کریں؟

مطالعۂ سیرت کی مختلف صورتیں ہو سکتی ہیں۔ مثلاً:

سیرت کا تاریخی مطالعہ- اس میں عرب کی تاریخ، مکہ، مدینہ اور اطراف حجاز کی تاریخ، زمانۂ ولادت کی سیاسی و سماجی صورت حال کی تاریخ، بعثت سے پہلے اور بعد کی تاریخ، اسی طرح اعلان نبوت اور بعد اعلان نبوت کی تاریخ کے ساتھ مکی، مدنی اور قبل ہجرت و بعد ہجرت کے تاریخی پہلوؤں کا مطالعہ شامل ہوگا۔

سیرت کا اخلاقی و تربیتی مطالعہ- اس میں حضور علیہ السلام کے اخلاق عالیہ، لوگوں کے ساتھ آپ کے رویے، گفتار و کردار، اپنوں اور غیروں کے ساتھ معاملات، دوستوں اور دشمنوں کے ساتھ سلوک، عائلی اور خانگی زندگی میں گھر والوں کے ساتھ سلوک۔ اسی کے ساتھ سکھ دکھ، غم اور خوشی، عفو و درگزر، صدق و امانت، عدل و انصاف، صبر و تحمل، تواضع و بردباری جیسے اخلاق اور ان تمام کے ساتھ بچوں، جوانوں، بوڑھوں، مرد و عورت سب کی تربیت کا نظام شامل ہوگا۔

معاشرتی و عائلی زندگی کا مطالعہ- اس میں یہ چیز قابل

ریسرچ اسکالر، شعبہ فارسی، بہار یونیورسٹی، مظفر پور aftabrashk@gmail.com

توجہ ہوں گی کہ رسول گرامی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم گھر میں بیوی بچوں کے ساتھ کس طرح پیش آتے تھے؟ ان کے ساتھ حضور علیہ السلام کے تعلقات کیسے تھے؟ عائلی زندگی/گھریلو زندگی میں آپ علیہ السلام گھر کے افراد کے ساتھ کتنا کوآپریٹ کرتے تھے؟ اسی کے ساتھ غلاموں، ماتحتوں، مزدوروں، یتیموں، بیواؤں، ضرورت مندوں، بے سہارا اور کم زور طبقوں کے ساتھ اور بھی دوسرے انسانوں کے ساتھ آپ کا کیا سلوک ہوتا تھا؟ مزید سماجی ناانصافیوں، زیادتیوں اور مختلف قسم کی برائیوں کی اصلاحات کے لیے آپ کی جدوجہد کا طریق کار کیا ہوتا تھا اور سماج کی بہتری اور بھلائی کے لیے آپ کس طرح اقدامات کیا کرتے تھے؟

دعوتی و تبلیغی مطالعہ- سیرت کا ہر ایک پہلو نہایت توجہ چاہتا ہے، لیکن یہ پہلو ایک عالم دین اور مبلغ کے لیے خصوصی انہماک کا متقاضی ہے۔ کیوں کہ ایک عالم دین اور ایک مبلغ اگر صاحب قلب سلیم اور اپنے دین کے لیے مخلص ہوگا تو وہ جہاں اور جس حال میں ہوگا کار دعوت سے پیچھے نہیں رہ سکے گا۔ اس لیے اسے تو اس پہلو کا بہت گہرائی سے مطالعہ کرنا چاہیے۔ اس میں مکی و مدنی دعوتی طریق کا فرق، حکمت اور نوعیت کے ساتھ اپنے اور غیروں کو دعوت دینے کا منہج، کار دعوت کے لیے استعمال کیے جانے والے ذرائع- تعلقات، ملاقات، خطبات، خطوط اور دوسرے طریقوں کے ساتھ دعوتی کام کے نتیجے میں آنے والی پریشانیوں پر صبر وغیرہ ساری چیزیں شامل مطالعہ رہیں گی۔ اس باب میں ایک قاری کو یہ چیز بھی سیکھنے کو ملے گی کہ کب، کہاں، کن سے، کیسے اور کتنی بات کس لہجے میں کرنی ہے؟ اگر دعوت کے ان پہلوؤں کو نظر انداز کر دیا جائے- تو ساری تگ و دو اور جملہ کوششیں بے اثر ہی نہیں، بلکہ الٹا وبال جان بن جائیں گی۔

سیرت کا روحانی مطالعہ- اس میں ایک بندہ مخلوق کے ہجوم میں کار جہاں میں مشغول رہتے ہوئے کس طرح اپنی عبادات، تقوی، تعلق باللہ، ذکر و فکر آخرت، دعا و اذکار، صوم و صلاۃ اور توکل و رضائے الٰہی میں اخلاص پیدا کر سکے گا؟ اور ان تمام اعمال کی کس طرح بجاآوری کر سکے گا؟ کہ اس کی دنیا بھی سلامت رہے اور آخرت بھی ہاتھ سے نہ جائے۔ کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

سیرت کا قانونی و سیاسی مطالعہ- اس میں سیرت کی روشنی میں قانون الٰہی/شریعت اسلامیہ کے بنیادی اصولوں کے ساتھ ریاست مدینہ کی تشکیل و تنظیم- صلح حدیبیہ، میثاق مدینہ- حکومت کی داخلی اور خارجی پالیسیوں اور جنگ و امن کے اصول و قواعد- دفاعی حکمت عملی، غزوات کی قیادت، میدان جنگ میں جنگ کے وصول و ضوابط، قیدیوں کے ساتھ سلوک اور امن بحالی کی کوششیں- ساتھ میں عالمی پیمانے پر دوسرے ممالک سے تعلقات و سفارات کے حدود و آداب- ساری چیزیں شامل مطالعہ رہیں گی۔

سیرت کا تعلیمی اور معاشی مطالعہ- اس میں تعلیم و تربیت کا نبوی منہج، مکاتیب اور مختلف احوال و کوائف میں مختلف صحابہ کے ذریعہ پوچھے گئے سوالات کے جوابات کے ساتھ معیشت و تجارت، صدقہ و زکاۃ، ذخیرہ اندوزی، سودی اور غیر سودی معاملات، بیت المال کا نظام اور کسب حلال جیسی چیزیں زیر مطالعہ رہیں گی۔ اس کے علاوہ بھی اور بھی جہتیں ہو سکتی ہیں جن کی روشنی میں سیرت رسول ﷺ کا مطالعہ کیا جانا چاہیے۔ لیکن ان تمام میں سب سے اہم جو چیز ہے وہ ہے **سیرت کا تطبیقی مطالعہ-** یعنی ہم آج، جہاں، جس حال میں ہیں وہاں سیرت کی روشنی میں ہمیں کیا اور کیسے کرنا چاہیے جس میں نہ صرف ہمارے لیے، بلکہ پوری انسانیت کے لیے خیر اور بھلائی مضمر ہو۔ سیرت کا مطالعہ- برائے مطالعہ- نہ ہو، بلکہ- مطالعہ برائے عمل- ہو۔ تاکہ ہم اپنی دنیا اور آخرت دونوں بہتر کر سکیں اور ایک پر امن، ترقی یافتہ مثالی معاشرے کی تشکیل کی راہ ہموار کر سکیں۔

کن کتابوں کا مطالعہ کریں: متقدمین میں خصوصیت کے ساتھ تین کتابوں: سیرت ابن ہشام، سیرت ابن اسحاق اور شفا شریف جب کہ متاخرین میں دو کتابوں: ضیاء النبی اور فقہ السیرۃ کا مطالعہ سیرت کے مختلف پہلوؤں کو سمجھنے میں کافی حد تک معاون ہوں گی۔ ◘

شعاعیں

حدیث قسطنطیہ اور یزید

محمد تحسین رضا نوری

ذرا اندازہ لگائیں کہ وہ شخص جنت نعیم کا حق دار کیسے ہو سکتا ہے جس کا دامن اہل بیت پاک مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کے خون سے تر بتر ہو، جس نے اصاغر و اکابر، ضعیف و نحیف مردوں اور بنات و خواتین کی پرواہ کیے بغیر سب کو اپنے ظلم کا نشانہ بنایا ہو، جو کہ نہایت ہی شقی و بد بخت، فاسق و فاجر، فتنہ گر و بدعتی، سنن مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کی سر عام دھجیاں اڑانے والا، صحابہ و تابعین کا قتل کرنے والا، حرمین شریفین کے تقدس کو پامال کرنے والا ہو، جس کے سر بلاد عرب کی دوشیزاؤں کی عصمت دری کا سنگین جرم شامل ہو ایسا ملعون شخص بھلا مغفور اور جنتی کیسے ہو سکتا ہے ؟

یزید کے سرکشی و ظلم و ستم کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب اہل مدینہ حضرت عبد اللہ بن حنظلہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے بیعت کرنے پر متفق ہو گئے اور اپنے جملہ معاملات کو آپ کے سپرد کر دیا، اور آپنے اُن سے تادم زیست یزید سے مقابلہ کرنے کی بیعت لی اور ارشاد فرمایا: "اے میری قوم! اللہ تعالیٰ سے ڈرو جس کا کوئی شریک نہیں، اللہ کی قسم! ہم یزید کے خلاف اس وقت اٹھ کھڑے ہوئے جب ہمیں یہ خوف ہونے لگا کہ کہیں ہم پر آسمان سے پتھروں کی بارش نہ ہونے لگے، وہ ایسا شخص ہے جو ماؤں، بیٹیوں اور بہنوں سے نکاح جائز قرار دیتا ہے، شراب نوشی کرتا ہے، نماز چھوڑتا ہے۔ (طبقات کبریٰ)

اب ذرا اندازہ لگاؤ کہ شریعت اسلامیہ سے کھلواڑ کرنے والا شخص جس کا ظلم اتنا بڑھ گیا کہ صحابہ کو یہ خوف ہونے لگا کہ ہم پر عذاب الٰہی کا نزول نہ ہو جائے، وہ شخص بھلا سعادت ابدی کا مستحق کیسے ہو سکتا ہے ؟

حدیث قسطنطنیہ اور اقوال ائمہ و محدثین:

اب آئیے اس حدیث کا صحیح مفہوم سمجھتے ہیں جس کے ذریعہ یزید کے حواریوں نے اسے بخشش و مغفرت کا تمغہ دے دیا۔

حدیث:-قال عمير، فحدثتنا أم حرام: أنها سمعت النبي صلى الله عليه وسلم، يقول: "أول جيش من أمتي يغزون البحر قد أوجبوا، قالت أم حرام: قلت: يا رسول الله أنا فيهم ؟ قال: أنت فيهم، ثم قال النبي صلى الله عليه وسلم: أول جيش من أمتي يغزون مدينة قيصر مغفور لهم، فقلت: أنا فيهم يا رسول الله ؟ قال: لا۔

ترجمہ: عمیر نے بیان کیا کہ ہم سے ام حرام رضی اللہ عنہا نے بیان کیا کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: "میری امت کا سب سے پہلا لشکر جو دریائی سفر کر کے جہاد کے لیے جائے گا، اس نے (اپنے لیے اللہ تعالیٰ کی رحمت و مغفرت) واجب کر لی"۔ ام حرام رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے عرض کی: "یا رسول اللہ ! کیا میں بھی ان کے ساتھ ہوں گی ؟ آپ نے فرمایا: ہاں، تم بھی ان کے ساتھ ہو گی۔ پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سب سے پہلا لشکر میری امت کا جو قیصر کے شہر (قسطنطنیہ) پر چڑھائی کرے گا ان کی مغفرت ہو گی۔ میں نے عرض کی: یا رسول اللہ میں بھی ان کے ساتھ ہوں گی ؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نہیں۔ (صحیح البخاری)

مذکورہ حدیث پر علما و محدثین نے نہایت طویل بحث فرمائی ہے اور بہت سے محدثین نے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ جنگ قسطنطنیہ میں یزید شامل ہی نہیں تھا، لہٰذا جب شمولیت ہی ثابت نہیں تو "مغفور لھم" کا مصداق کیسے ٹھہرا؟ اور اگر بالفرض یہ تسلیم کر بھی لیں کہ شامل تھا پھر بھی اس حدیث کے ذریعہ اس کی مغفرت ثابت نہیں ہوتی جیسا کہ "امام ابن حجر عسقلانی الشافعی رحمۃ اللہ علیہ" اپنی مشہور زمانہ کتاب فتح الباری شرح بخاری کی

خادم تدریس: جامعہ فاطمہ شاہجہاں پور razatahseen531@gmail.com

جلد نمبر6 میں اور "امام امام بدر الدین عینی الحنفی رحمۃ اللہ علیہ" عمدۃ القاری شرح بخاری میں جلد نمبر14 پر اور امام شہاب الدین قسطلانی رحمۃ اللہ علیہ ارشاد الساری شرح بخاری میں جلد 6 یزیدیوں کے اس بے بنیاد استدلال کا رد فرماتے ہوئے لکھتے ہیں (تینوں آئمہ کا قول تقریبًا ایک ہی ہے اس بنا پر طوالت سے بچتے ہوئے صرف ایک ہی کے قول پر اکتفاء کیا گیا ہے) کہ:

"لا يلزم من دخوله فی ذلك العموم ان لا يخرج بدليل خاص اذ لا يختلف اهل العلم ان قوله صلى اللهؐ عليه وسلم "مغفور لهم" مشروط بان يكونوا من اهل المغفرة حتى لو ارتد واحد ممن غزاها بعد ذلك لم يدخل فی ذلك العموم."

اس عبارت کا مفہومی ترجمہ دیکھتے چلیں کہ: "اگر ہم یزید کی اس جنگ میں شمولیت تسلیم کر بھی لیں تو رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے جو بخشش کا پروانہ دیا ہے وہ اس جنگ سے پہلے کے گناہوں کی بخشش ہے یعنی یزید پلید کے جو اس جنگ سے پہلے کے گناہ تھے وہ اس جنگ کے سبب بخشے گئے مگر یزید پلید نے جو ظلم اس جنگ کے بعد ڈھائے وہ کسی سے ڈھکے چھپے نہیں ہیں، لہٰذا وہ اس عموم کے تحت شامل نہیں"۔

مذکورہ حدیث کی دوسری توجیہ:

بعض محدثین نے اس حدیث کی ضمن میں فرمایا کہ اس حدیث شریف میں مدینۂ قیصر سے مراد قسطنطنیہ نہیں ہے بلکہ حمص ہے جو کہ عہد رسالت صلی اللہ علیہ وسلم میں روم کا دار الحکومت تھا، جیسا کہ فتح الباری میں مذکور ہے کہ: "بعض شارحین نے کہا ہے کہ مدینۂ قیصر سے مراد وہ شہر ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک زندگی میں قیصر کا شہر تھا اور وہ حمص ہے، اور اس وقت وہی اس کا دار الحکومت تھا"۔

حدیث پاک کی یہ توجیہ قابل غور ہے کہ اس حدیث اور اس کی متعلق دیگر روایات میں "مدينة قيصر" کے الفاظ وارد ہیں، حدیث شریف کے کلمات کے مطابق وہ شہر حمص ہی ہے جو کہ خلافت فاروقی میں ۱۵ ہجری میں حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی قیادت میں فتح ہوا، اس معرکہ میں حضرت خالد بن ولید، حضرت بلال، حضرت مقداد رضی اللہ تعالیٰ عنہم سمیت دیگر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین موجود تھے، اور یہ وہ زمانہ تھا جس میں یزید پیدا بھی نہیں ہوا تھا چہ جائے کہ اس معرکہ میں شرکت کرنا، کیوں کہ یزید کی پیدائش 26 ہجری میں ہوئی تھی۔

حدیث قسطنطنیہ کی تیسری توجیہ:

بعض محدثین و شارحین نے فرمایا کہ احادیث میں موجود "مدينة قيصر" کے الفاظ سے مراد قسطنطنیہ ہی ہے، لیکن پھر بھی یزید اس بشارت کا مستحق نہیں ٹھہرتا اس لیے کہ قسطنطنیہ پر اہل اسلام نے متعدّد مرتبہ حملے لیے، اور حدیث میں وارد بشارت عظمیٰ صرف پہلی بار حملہ کرنے والوں کے لیے ہے۔

آئیے معلوم کرتے ہیں کہ کس کس سنہ میں قسطنطنیہ پر حملے کیے گئے، البدایہ والنہایہ کی جلد 07 میں ہے کہ: 32 ہجری میں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے روم پر حملہ کیا، معرکے سر کرتے رہے یہاں تک کہ قسطنطنیہ کی تنگ نائے تک پہنچ گئے۔ اسی طرح التاریخ الکامل کی جلد نمبر 3 میں بھی مذکور ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ قسطنطنیہ پر پہلی مرتبہ حملہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے 32 ہجری میں کیا، اور اس اعتبار سے یزید کا اس جنگ میں شامل ہونا ثابت نہیں ہوتا کیوں کہ 32 ہجری میں یزید کی عمر صرف 6 سال کی تھی۔ اور دوسری مرتبہ حملہ سن 43 ہجری میں حضرت بسر ابن ارطاۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی قیادت میں ہوا جو کہ البدایہ والنہایہ کی جلد نمبر 8 میں موجود ہے۔ اور تیسرا حملہ 44 ہجری یا 46 ہجری میں ہوا جیسا کہ التاریخ الکامل میں دونوں روایتوں کے واقعات کا ذکر موجود ہے۔

قسطنطنیہ پر حملہ کرنے والے تیسرے لشکر کے امیر حضرت عبد الرحمٰن بن خالد بن ولید تھے، اس حملے کا ذکر کتب تاریخ کے علاوہ صحاح ستہ کی معتبر کتاب سنن ابو داؤد میں بھی ہے۔ لہٰذا مذکورہ حوالہ جات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ قسطنطنیہ پر پہلی مرتبہ حملہ کرنے والا لشکر حضرت امیر معاویہ کا ہے جو کہ بخاری شریف میں موجود بشارت عظمیٰ کا مستحق ہے۔ (باقی ص:15 پر) ■■■

انوار حیات

علامہ سید احمد شاہ قادری سریکوٹی رحمۃ اللہ علیہ-حیات و خدمات

محمد ضیاء نعمانی مصباحی

بنگلہ دیش سے پچیس سو کلومیٹر سے زیادہ دور رہنے والے ایک عظیم ولی اور بلند پایہ عالم ربانی حضرت مولانا سید احمد شاہ قادری سریکوٹی رحمۃ اللہ علیہ نے بنگلہ دیش کی سرزمین پر سب سے پہلے اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خاں بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کے مسلک کی ترویج و اشاعت کے لیے ایک عظیم الشان ادارہ جامعہ احمدیہ سنیہ کے نام سے قائم کیا۔ اور فرمایا کہ:"میں نے اس (جامعہ) کی بنیاد اعلیٰ حضرت امام اہل سنت امام احمد رضا محدث بریلی رحمہ اللہ کے مسلک پر رکھی ہے، اس کے ذریعے بنگلہ دیش کے مسلمانوں پر انھوں نے جو احسان کیا ہے، اس کا فیضان اس وقت تک جاری رہے گا جب تک اس سرزمین میں مسلمان موجود ہیں۔"

شتالو شریف، صوبہ خیبر پختونخواہ کے ضلع ہزارہ میں واقع، کوہستانی سلسلے کا ایک پہاڑی علاقہ ہے جسے کوہ گنگا بھی کہا جاتا ہے۔ اس پہاڑی سلسلے کی سب سے اونچی چوٹی جو کبھی سرے کوہ کے نام سے جانی جاتی تھی، یعنی پہاڑ کا سر یا چوٹی، وقت کے ساتھ ساتھ سری کوٹ کے نام سے جانا جانے لگا۔ اس سری کوٹ میں مشوانی قبیلے کی ایک بستی قائم ہوئی۔ 1857ء میں وہاں آباد سادات خاندان میں مولانا سید احمد شاہ قادری سریکوٹی رحمۃ اللہ علیہ پیدا ہوئے۔

چوں کہ وہ سری کوٹ میں پیدا ہوئے تھے، اس لیے ان کے نام کے آخر میں "سری کوٹی" کی نسبت، جو ان کے علاقے کی نشان دہی کرتی ہے، شامل کر دی گئی۔ آپ کی کنیت ابو محمد تھی۔ آپ حسینی سید تھے، آپ کے والد کا نام مولانا سید محمد صدر شاہ رحمۃ اللہ علیہ تھا۔

بچپن میں اپنے والد سے قرآن مجید تجوید کے ساتھ حفظ کیا اور ابتدائی دینی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی۔ بعد ازاں انھوں نے اپنے علاقے کے نامور علماے کرام سے علم دین حاصل کیا۔ اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے اپنا آبائی شہر چھوڑا اور مختلف مقامات کا سفر کیا، قرآن و حدیث، فقہ، اصول فقہ، نحو و صرف سمیت کئی دینی علوم میں مہارت حاصل کی۔ ان کی ذہانت، فطانت، دین سے گہری محبت اور لگن انھیں معاصر علما میں منفرد بناتی ہے۔ انھوں نے اپنی زندگی دین اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے لیے وقف کر دی تاکہ لوگوں کو گمراہی سے بچایا جا سکے۔ یہ اللہ کی اپنے نیک بندوں پر خصوصی رحمت کی ایک مثال ہے۔

آپ کی مادری زبان پشتو تھی۔ آپ کو قدوۃ الاولیاء، بقیۃ السلف، عمدۃ العلماء، زبدۃ الاصفیا، سفیر اسلام اور مبلغ اسلام کے اعزازی القاب سے نوازا گیا۔ یہ ان کی فعال زندگی اور مذہب اور قوم کے لیے ان کی نمایاں خدمات کو ظاہر کرتے ہیں۔

اپنی مذہبی تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہ کیپ ٹاؤن، زنجبار، اور ممباسا، جنوبی افریقہ میں اسلام کی تبلیغ اور کلمۃ الحق کی دعوت کے لیے نکل پڑے۔ آپ نے سنت نبوی پر عمل کرتے ہوئے تجارت بھی کی تاکہ کسی کے سامنے ہاتھ نہ پھیلانا پڑے۔ آپ خوش الحان قاری بھی تھے۔ آپ کی تلاوت قرآن سن کر لوگوں پر رقت طاری ہو جاتی تھی، آپ کی لاجواب تلاوت سننے کے بعد لاتعداد لوگ راہ ہدایت پر آئے، حتیٰ کہ بہت سے غیر مسلم مشرف بہ اسلام ہوئے ہیں۔ افریقہ میں طویل قیام کے بعد آپ 1912ء میں اپنے وطن واپس آئے۔ آپ ایک عالم دین ہونے کے ساتھ ساتھ کامیاب تاجر بھی تھے۔ علم و دولت کی فراوانی کے باوجود آپ اپنے ذہن میں ادھورا پن محسوس کرنے لگے۔ وہ بدستور بڑھتا رہا۔ آپ کے رویے میں تبدیلی نظر آنے لگی۔ مثال کے طور پر عشا کی نماز دیر سے پڑھتے تھے جو کہ معمول کی طرز زندگی کے خلاف تھا۔ یہ تبدیلی ان کی اہلیہ سیدہ خاتون کو نظر نواز

متعلم: جامعہ اشرفیہ مبارک پور۔ zianomani406@gmail.com

ہوئی وہ فکر مند ہوئیں اور کسی پیر کامل سے بیعت ہونے کا مشورہ دیا۔ پہلے تو آپ نے انکار کیا اور کہا کیا کامل پیر اب کہیں ہے؟ میں نے جتنے پیر دیکھے ہیں وہ جعلی ہیں! وہ اپنی روزی روٹی کے لیے پیری مریدی کرتے ہیں۔ سیدہ خاتون نے جواب دیا کہ آپ اس زمانے کے غوث حضرت خواجہ عبد الرحمٰن چھوہروی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت ہوجائیں، وہ جعلی نہیں بلکہ اللہ عزوجل کے سچے پکے ولی ہیں۔ آپ کے بار بار انکار کے باوجود سیدہ خاتون نے کہا کہ جاکر دیکھیں تو سہی کہ وہ کس معیار کے ہیں اور ہری پور بازار میں ایک دکان کھول لیجیے، اس سے معیشت کا انتظام بھی ہو جائے گا، اگر آپ کو پسند آئے تو بیعت ہوجائیں، ورنہ واپس آ جائیں۔ اہلیہ کے مشورے پر انھوں نے ہری پور بازار میں کپڑے کی دکان کھول لی۔ اور حضرت خواجہ عبد الرحمٰن چھوہروی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس تشریف لے گئے اور ان سے بے حد متاثر ہوئے اور سلسلہ عالیہ قادریہ میں آپ سے بیعت ہوئے۔

آپ خیبر پختونخواہ کی دور دراز پہاڑی سڑکوں سے گیارہ میل یا اٹھارہ میل کا فاصلہ طے کرکے لکڑیاں اکٹھی کرکے اپنے کندھوں پر چوہڑ شریف میں اپنے پیر کے لنگر خانہ تک لے جاتے۔ آپ نے کئی سال تک یہ خدمت انجام دی۔ اس کی وجہ سے آپ کے کندھے پر ایک پھوڑا ہو گیا جو گہرے زخم میں بدل گیا۔ اس زخم کو بھرنے میں تقریباً ایک سال لگ گیا۔ آپ اس زخم کا نشان دکھاتے اور کہتے کہ یہ مہر بابا جی کی مجھ پر مہربانی کی نشانی ہے۔ علوم ظاہری حاصل کرنے کے بعد آپ نے ذکر، اذکار، مجاہدہ اور ریاضت کے ذریعے اپنے شیخ کی قربت حاصل کی۔ پھر آپ کے پیر و مرشد نے ان کے لیے باطنی علم کا دروازہ کھول دیا۔

1920ء میں آپ اپنا وطن چھوڑ کر برما کے دارالحکومت رنگون چلے گئے اور دوبارہ اسلام کی تبلیغ و اشاعت شروع کی۔ آپ دو دہائیوں سے زیادہ وہاں رہے۔ رنگون میں آپ کو بنگالی سنی جامع مسجد میں امام اور خطیب مقرر کیا گیا۔ آپ نے قرآن و حدیث کی دعوت و تبلیغ اور سلسلہ عالیہ قادریہ کے ترویج و اشاعت پر توجہ دی۔ آپ کی شخصیت، آواز اور تلاوت اتنی مسحور کن تھی کہ کچھ ہی عرصے میں آپ نے مقامی لوگوں میں اثر و رسوخ حاصل کر لیا۔ ان کی دعوت و تبلیغ کی وجہ سے بہت سے لوگوں نے توبہ کی اور نیک، متقی بن گئے۔

31 اکتوبر 1930ء بروز جمعہ خلیفہ اعلیٰ حضرت علامہ مولانا حشمت علی خان لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ رنگون کی بنگالی سنی جامع مسجد میں تشریف لائے۔ ان کو دیکھ کر حضرت سید احمد شاہ قادری رحمۃ اللہ علیہ بہت خوش ہوئے اور منبر و محراب کو آپ کی خدمت میں پیش کیا۔ مولانا حشمت علی خان رحمۃ اللہ علیہ نے جمعہ میں وعظ و نصیحت کی، نماز جمعہ کی امامت فرمائی۔ حضرت سید احمد شاہ قادری سریکوٹی رحمۃ اللہ علیہ نے جمعہ کی نماز ان کے پیچھے ادا کی۔

حضرت سید احمد شاہ قادری سریکوٹی رحمۃ اللہ علیہ کو اپنے شیخ طریقت سے بہت محبت تھی اور اکثر اپنے مرشد کا ذکر محبت سے فرماتے تھے۔ نتیجتاً رنگون میں بہت سے لوگوں نے حضرت خواجہ چھوہروی رحمۃ اللہ علیہ سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ آپ نے یہ درخواست اپنے مرشد کے سامنے پیش کی۔ خواجہ چھوہروی نے ایک رومال بھیج کر فرمایا کہ جو شخص سحری کے وقت وضو کی حالت میں اس رومال پر ہاتھ رکھے وہ میرا مرید ہو جائے گا۔ اس طرح بے شمار لوگ ان کے حلقۂ ارادت میں شامل ہوئے۔ کچھ عرصہ بعد حضرت خواجہ چھوہروی نے حضرت سید احمد شاہ قادری رحمۃ اللہ علیہ کو اجازت و خلافت عطا فرمائی۔

1925ء میں، آپ نے رنگون میں انجمن رحمانیہ کی بنیاد رکھی، جو 1948ء سے مشرقی پاکستان میں انجمن رحمانیہ احمدیہ سنیہ ٹرسٹ کے نام سے کام کر رہی ہے۔ رنگون میں آپ نے اپنے مرشد کی حکم سے مجموعہ صلوٰۃ الرسول شریف کی تین جلدوں کے طباعت کا انتظام کیا۔ 1928ء میں اپنے بڑے بیٹے مولانا سید محمد صالح شاہ رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کی خبر ملنے کے بعد بھی آپ نے رنگون نہیں چھوڑا۔ انھوں نے لکھا کہ ”میں برما میں تھا، میں نے سب کچھ اللہ کے سپرد کر دیا، مرشد کے حکم پر میں نے عہد کیا کہ جب تک دارالعلوم اسلامیہ رحمانیہ کی خدمت اور مجمع صلوٰۃ الرسول کی اشاعت نہیں ہو جاتی میں واپس نہیں آؤں گا۔“

اس کتاب کا پہلا ایڈیشن 1933ء میں چھپا تھا۔

آپ 1936ء میں چٹاگانگ کے روزنامہ آزادی کے ایڈیٹر انجینئر عبدالخالق کی درخواست پر چٹاگانگ تشریف لائے۔ 1941ء میں آپ نے رنگون میں مسلمانوں پر بمباری کی پیش گوئی کی اور انھیں محفوظ مقام پر منتقل ہونے کا مشورہ دیا۔ آپ کے حکم کے تحت بہت سے لوگ رنگون سے نکلے اور بحفاظت اپنی منزلوں پر پہنچ گئے۔ آپ 1942ء میں چٹاگانگ واپس آئے اور 1948ء تک ہر موسم سرما میں وہیں رہے۔ ڈھاکہ میں انجمن رحمانیہ احمدیہ سنیہ کی سرگرمیوں کا آغاز کیا۔ چٹاگانگ میں آپ "پشاوری پیر صاحب" اور "افریقہ والا پیر" کے نام سے جانے جاتے تھے۔

1950ء میں شہر باش کھالی گاؤں شاہیر خیل میں ایک محفل میں آیات درود پڑھیں لیکن حاضرین میں سے کسی نے درود نہیں پڑھا۔ وہ چونک گئے اور کہنے لگے کہ یہاں مدرسہ کی ضرورت ہے۔ آپ نے کہا کہ کوئی ایسی جگہ تلاش کرو جو شہر یا گاؤں نہ ہو، جہاں مسجد اور تالاب ہو۔ سولہ شہر ناظر پاڑہ میں ایک جگہ منتخب فرمایا۔ 1954ء میں آپ نے جامعہ احمدیہ کا سنگ بنیاد رکھا اور فرمایا کہ اس جامعہ کی بنیاد اعلیٰ حضرت کے مسلک پر رکھی۔ مفتی اعظم پاکستان - مفتی وقار الدین قادری رحمۃ اللہ علیہ اس جامعہ کے پہلے پرنسپل ہوئے اور نام کے ساتھ "سنیہ" کا اضافہ کرنے کی تجویز پیش کی۔

علامہ سید احمد شاہ سریکوٹی رحمۃ اللہ علیہ کے قائم کردہ اس جامعہ نے خوب ترقی کی اور آج بنگلہ دیش میں اہل سنت و جماعت کے مرکزی دارالعلوم کی حیثیت سے دینی و ملی خدمات انجام دے رہا ہے۔ جس میں تقریباً دس ہزار طلبا زیر تعلیم ہیں۔

آپ نے اور آپ کے آل و اولاد نے بنگلہ دیش میں سیکڑوں سنی مدارس قائم کیے ہیں، آپ کی اولاد میں سے عارف باللہ حضرت مولانا حافظ قاری سید محمد طیب شاہ قادری سریکوٹی رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے لخت جگر علامہ حافظ قاری پیر سید محمد طاہر شاہ قادری سریکوٹی حفظہ اللہ اور پیر بنگال حضرت علامہ سید محمد صابر شاہ قادری سریکوٹی حفظہ اللہ سابق وزیر اعلیٰ خیبر پختون خواہ، پاکستان اور دیگر فرزندگان ہر سال بنگلہ دیش کا تبلیغی دورہ فرماتے رہتے ہیں، برصغیر ہند و پاک کا سب سے بڑا جشن عید میلاد النبی کا جلوس ہر سال بنگلہ دیش میں اسی خاندان کی سرپرستی میں ہوتا ہے، جس میں لاکھوں لوگ شرکت کرتے ہیں۔

حضرت سید احمد شاہ قادری سریکوٹی رحمۃ اللہ علیہ نے چالیس سال تک ہری پور میں دارالعلوم اسلامیہ رحمانیہ کی خدمت کی۔ آپ کی نگرانی میں اساتذہ کی رہائش گاہیں اور طلبہ کے ہوسٹل بنائے گئے اور آپ نے رنگون سے باقاعدہ تنخواہیں بھیجنے کا بھی انتظام کیا۔ پاکستان کے قومی اسمبلی کے سپیکر فضل القادر چودھری آپ سے گہرا لگاؤ رکھتے تھے اور دارالعلوم کا دورہ کرنے کے بعد پچاس ہزار روپے کا عطیہ دیا اور اس وقت کے فیلڈ مارشل ایوب خان نے 2 لاکھ روپے عطیہ دیا۔

حضرت سید احمد شاہ قادری سریکوٹی رحمۃ اللہ علیہ نے دو مرتبہ 1945ء اور 1958ء میں حج کیا، آپ نے مشرقی پاکستان کا آخری دورہ 1958ء میں کیا۔ آپ نے افریقہ سے رنگون، ہری پور سے چٹاگانگ تک ہزاروں میل کا سفر کرکے دین کی تبلیغ کی۔ اگرچہ آپ سے بے شمار کرامتوں کا ظہور ہوا لیکن آپ نے استقامت کو ان سب چیزوں پر ترجیح دی آپ کا لباس اور طرز عمل سادہ تھا۔ ہمیشہ سنت پر عمل کرتے تھے۔ ان کو قریب سے دیکھنے والوں نے کہا کہ وہ نیند میں بھی سنت ادا کرنے میں احتیاط کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ سنت پر عمل کرنا ہی اصل کرامت ہے۔ اپنی وفات سے ایک ماہ قبل فرمایا کہ اللہ کے مہمان کی رخصتی کا وقت قریب آگیا ہے۔

11 ذوالقعدہ 1380ھ مطابق 25 مئی 1961ء میں تقریباً 104 سال کی عمر میں سری کوٹ شریف میں ان کا انتقال ہوا۔

حوالہ جات:

- تذکرہ اکابرین اہل سنت از: علامہ عبدالحکیم شرف قادری
- تذکرہ علما و مشائخ سرحد از: مولانا سید محمد امیر شاہ گیلانی
- شجرہ شریف سلسلہ عالیہ قادریہ، شٹالو شریف
- حیات حضرت خواجہ عبدالرحمٰن چھوہروی از: ڈاکٹر سیف العالم نائب پرنسپل: جامعہ احمدیہ سنیہ نسواں کامل مدرسہ، چٹاگانگ، بنگلہ دیش۔ ◘

آئینۂ وطن

مسلمانوں کا سیاسی نصب العین؟

حافظ افتخار احمد قادری

بھارت کے موجودہ حالات میں مسلمانوں کا سیاسی نصب العین کیا ہو؟ یہ ایک بہت ہی اہم اور سنجیدہ سوال ہے۔ اس پر بڑی سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے کی ضرورت ہے۔ کیوں کہ آزاد بھارت کی 77 سالہ تاریخ میں بھارت کے مسلمان آج تک کسی واضح نصب العین سے یکسر محروم ہیں۔ یہاں سب کچھ دھندلا، مبہم اور منتشر ہے۔ مسلمانوں کا سیاسی نصب العین کیا ہو؟ بظاہر تو یہ ایک چھوٹا سا سوال ہے لیکن اپنے اندر یہ بہت ہی جامعیت رکھتا ہے۔ آج ہمیں اس کا جواب تلاش کرنا ہوگا ورنہ کسی واضح اور متعیّن نصب العین سے محروم کمزور مسلم قیادت اپنی اپنی ڈفلی بجاتی رہے گی اور منتشر قوم آئے دن زندگی کے ہر میدان میں شکست وریخت سے دوچار ہوتی نظر آئے گی۔

سیاسی نصب العین کو بیان کرنے سے قبل اس بات کو سمجھ لیا جائے کہ اسلامی تعلیمات وہدایات کی روشنی میں بحیثیتِ مسلمان بھارت کے مسلمانوں پر کیا کیا مستقل ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں؟ تاکہ ہمارے سامنے ہماری مستقل ذمہ داریاں بھی آجائیں اور ہم اپنے سیاسی نصب العین سے بھی آگاہ ہوجائیں۔

قرآن و احادیث اور تاریخ اسلام کے مطالعہ سے یہ حقیقت آشکارا ہوتی ہے کہ مذہب اسلام نے تمام مسلمانان عالم پر بعض ایسی ذمہ داریاں عائد کر رکھی ہیں کہ حالات چاہے جیسے بھی ہوں۔ سازگار ہوں یا ناسازگار، مسلمان صاحب اقتدار ہوں یا عام رعایا، آقا ہو کہ غلام ہر حال میں ان ذمہ داریوں کو انھیں انجام دینا ہوتا ہے۔ ان ذمہ داریوں کو بیان کرنے کی کوشش کر رہا ہوں قارئین ملاحظہ فرمائیں۔

اول: دین پر قائم رہنا۔ دوم: دین کی دعوت عام کرنا

سوم: عدل وانصاف کی علم برداری

چہارم: خیر کی طرف بلانا اور شر سے باز رکھنا

دین پر قائم رہنا: حالات چاہے جیسے بھی ہوں ہر حال میں مسلمانوں پر فرض ہے کہ وہ دین پر پوری مضبوطی کے ساتھ قائم رہیں۔ جیسا کہ اللہ رب العزت کا فرمان ہے:

”وَ اَنْ اَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا وَّۚ لَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ“۔ (الیونس)

حضرت سیدنا ابوالحسن سری سقطی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مرتبہ 60 دینار کے بادام خریدے پھر انھیں بیچنے کے لیے ان کی قیمت 63 دینار رکھی۔ ایک تاجر نے ان سے سارے بادام خریدنے کے لیے قیمت پوچھی تو آپ نے فرمایا: 63 دینار۔ دوسروں کا بھلا چاہنے والے اس تاجر نے کہا: حضور! باداموں کا ریٹ بڑھ چکا ہے لہٰذا! آپ 90 دینار میں یہ بادام مجھے بیچ دیں۔ آپ نے فرمایا: میں نے اپنے رب سے وعدہ کیا ہوا ہے کہ تین دینار سے زیادہ نفع نہیں لوں گا۔ جب اس تاجر نے یہ بات سنی تو کہنے لگا: میں نے بھی اپنے پاک پروردگار سے یہ عہد کر رکھا ہے کہ کبھی بھی کسی مسلمان بھائی کے ساتھ دھوکا نہیں کروں گا۔ لہٰذا! میں تو آپ سے یہ بادام 90 دینار میں ہی خریدوں گا۔ چنانچہ نہ تو آپ رحمۃ اللہ علیہ تین دینار سے زیادہ نفع لینے پر راضی ہوئے اور نہ وہ تاجر 90 دینار سے کم میں خریدنے پر تیار ہوا۔ (عیون الحکایات: 164)

ہمارے بزرگانِ دین رحمۃ اللہ علیہم کا اندازِ تجارت کیسا اعلیٰ اور شان دار ہوا کرتا تھا۔ وہ واقعی اپنی قبر وآخرت کی فکر کرنے والے، مسلمانوں کا بھلا چاہنے والے، اپنے دین کو دنیا پر ترجیح دینے والے تھے۔ ان کے نزدیک دین کے مقابلے میں دنیا کے مال و اسباب کی کوئی اہمیت نہیں ہوا کرتی تھی، ان کی تجارت بھی اپنے رب کو راضی کرنے کا ذریعہ ہوتی تھی۔ مگر افسوس! آج

کریم گنج، پورن پور، پیلی بھیت، یوپی iftikharahmadquadri@gmail.com

مسلمانوں کی ایک بھاری تعداد نے دنیا ہی کو اپنا سب کچھ سمجھ رکھا ہے۔ مرنے، اندھیری قبر میں اترنے اور قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حساب و کتاب کے لیے پیش ہونے کو شاید ایک تعداد بالکل بھول ہی چکی ہے۔ ان کی تجارت میں جھوٹ، بد دیانتی، دھوکا اور سود و رشوت خوری جیسی کئی طرح کی لعنتیں شامل ہوچکی ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ ان ہی طرح کی چیزوں اور تجارت کی مزید خرابیوں کو دیکھتے ہوئے حضرت سیدنا مالک بن دینار رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہو: ''بازار مال کو تو بڑھاتا ہے مگر دین لے کر چلا جاتا ہے''۔ (حلیۃ الاولیاء:436/2)

آج دنیا کی دولت کمانے کی خاطر اور دین پر دنیا کو ترجیح دیتے ہوئے ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو لوٹ رہا ہے۔ فانی دنیا کے چند سکوں کی خاطر اپنے دین کو نقصان پہنچا رہا ہے بلکہ کچھ بد نصیب تو معاذ اللہ اس حد تک جا پہنچے کہ انھوں نے فانی دنیا کے لیے اپنے سچے دین کو بھی چھوڑ دیا اور جہنم کی آگ میں ہمیشہ رہنے کو ترجیح دی۔ اس کے نظارے ماضی قریب و بعید میں دیکھے اور سنے جا چکے ہیں۔ حالاں کہ جس آخری نبی ﷺ کا ہم کلمہ پڑھتے ہیں ان کی تعلیمات اور خود ان کی ساری حیاتِ طیبہ تو دنیا پر دین کی ترجیح کو ثابت کرتی اور ہمیں اس پیارے دین پر مضبوطی سے قائم رہنے کا درس دیتی ہے۔ حضورِ اقدس ﷺ کثرت سے یہ دعا فرمایا کرتے تھے: ''اے دلوں کو بدلنے والے میرے دل کو اپنے دین پر قائم رکھ''۔ (ترمذی شریف:55/04)

حضورِ اقدس ﷺ کا ارشاد ہے: لا الہ الا اللہ کہنا بندوں سے اللہ پاک کے غضب کو ہمیشہ دور کرتا رہے گا یہاں تک کہ لوگ جب اس حالت کو پہنچیں گے کہ ان کی دنیا سلامت ہوگی اور انھیں اپنے دینی نقصان کی کوئی پرواہ نہ ہوگی پھر وہ یہ کلمہ کہیں گے تو اللہ پاک ارشاد فرمائے گا: ''تم جھوٹے ہو''۔ (نوادر الاصول:784/02)

تابعی بزرگ حضرت سیدنا حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اے ابن آدم! اپنے دین کی خوب حفاظت کر کیوں کہ تیرا دین ہی تیرا گوشت اور تیرا خون ہے۔ اگر تیرا دین سلامت رہے گا تو تیرا گوشت اور خون بھی سلامت رہے گا لیکن اگر معاملہ اس کے برعکس ہوا یعنی تیرا دین سلامت نہ رہا تو پھر ہم (جہنم کی) نہ بجھنے والی آگ، نہ بھرنے والے زخم اور نہ ختم ہونے والے عذاب سے اللہ پاک کی پناہ مانگتے ہیں۔ (حلیۃ الاولیاء:167/02)

یقیناً مسلمان کا زندگی کے تمام معاملات میں اپنے دین پر عمل کرنا اور اسے دنیا پر ترجیح دینا مٹی پر سونے کو اور جہنم پر جنت ہی کو ترجیح اور اسے ہی اہمیت دینا ہے۔ حضرت سیدنا احمد بن حرب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: (گرمیوں میں) لوگ سورج (کی تپش سے بچنے کے لیے دھوپ) پر سائے کو تو ترجیح دیتے ہیں مگر جہنم پر جنت کو ترجیح نہیں دیتے۔ (مکاشفۃ القلوب:151)

دنیا نے ایک دن فنا اور ختم ہو ہی جانا ہے۔ اپنے معمولات زندگی میں دین اور شریعت ہی کو اہمیت دینا ہمیں قبر و آخرت میں نجات دلوا سکتا ہے۔ لہٰذا! بہتری اسی میں ہے کہ ہم اپنے دین کو دنیا پر ترجیح دیں، ہر وہ بات جو آپ بولنا اور ہر وہ کام جو آپ کرنا چاہتے ہیں اس میں غور کیجیے کہ آپ کا دین اس حوالے سے آپ کی کیا رہنمائی کرتا ہے؟ آپ کا خالق و مالک اس بارے میں کیا حکم فرماتا ہے؟ اس کے پیارے اور آخری نبی ﷺ کی اس حوالے سے کیا تعلیمات ہیں؟ وارثین انبیا یعنی علمائے اہلِ سنت اس بارے میں آپ کو دین و شریعت کا کیا مسئلہ بتاتے ہیں؟ اور پھر دین و شریعت کی معلومات ملنے کے بعد اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ کو اپنے دین کو ترجیح اور اہمیت دیتے ہوئے اس رہنمائی کے مطابق خود کو چلانے کی توفیق عطا فرمائے۔

دین کی دعوت عام کرنا: مسلمانوں کی دوسری مستقل ذمہ داری یہ ہے کہ ملک و سماج کے حالات خواہ کیسے بھی ہوں موافق ہوں یا ناموافق، بہر صورت دین کی دعوت کو عام کریں۔ یعنی مسلمانوں کو اللہ رب العزت کے دن کی طرف بلائیں۔ البتہ اس اہم خدمت کے لیے حکمت و دانائی اور تذکیر و موعظت کا دامن کبھی بھی ہاتھ سے نہ چھوڑیں تاکہ دعوت کارگر مؤثر ثابت ہوسکے۔ فرمان باری تعالیٰ ہے:

''اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَ الْمَوْعِظَةِ''۔ (النحل)

اس کام کے لیے حکمت و موعظت کے ساتھ ساتھ اخلاص وللّٰہیت، جرات و ہمت اور باضابطہ طور پر طویل المیعاد پلاننگ و منصوبہ بندی بھی ضروری ہے کیونکہ منصوبہ و پلاننگ کے بغیر اٹھایا جانے والا کوئی قدم دیرپا ثابت نہیں ہوتا۔

حضرت سیدنا کعب احبار رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: حضرت سیدنا آدم علیہ السلام نے اپنی وفات سے تین سو سال قبل سب سے پہلے عربی و سریانی زبانوں میں کتابیں لکھیں۔ پہلے انھیں گیلی مٹی پر لکھا اور پھر آگ سے پختہ کیا۔ (روح البیان 473/10)

حضرت سیدنا سلیمان علیہ السلام نے ملکہ بلقیس کو اسلام کی دعوت دینے کے لیے ایک خط لکھا جس کا ذکر قرآن کریم میں موجود ہے۔ (النمل:28)

صلح حدیبیہ کے بعد جب جنگ و جدال کے خطرات ٹل گئے اور ہر طرف امن و سکون کی فضا پیدا ہوگئی تو رسول اللہ ﷺ نے روم کے بادشاہ قیصر، فارس کے بادشاہ کسریٰ، حبشہ کے بادشاہ نجاشی، مصر کے بادشاہ عزیز اور دوسرے سلاطین عرب و عجم کے نام دعوت اسلام کے خطوط روانہ فرمائے۔ (سیرتِ مصطفیٰ ﷺ:364)

مخلوق کو خالق کی طرف بلانے کا ایک اہم ذریعہ درس و بیان اور انفرادی کوشش کرنا بھی ہے۔ انبیائے کرام علیہم السلام ہر دور میں اللہ تعالیٰ کے بندوں کو زبانی طور پر اللہ کی طرف بلاتے رہے یہاں تک کہ اللہ کے آخری نبی حضورِ اقدس ﷺ نے بھی یہی انداز اختیار فرمایا۔ جب اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب ﷺ کو خاندان کے قریبی لوگوں کو نیکی کی دعوت دینے کا حکم فرمایا تو حضورِ اکرم ﷺ نے کوہِ صفا پر تشریف لے جاکر اپنے بیان کے ذریعے لوگوں کو اللہ تعالیٰ کے دین کی طرف بلایا۔ اعلان نبوت کے بعد اپنی 23 سالہ ظاہری حیات میں نبی کریم ﷺ نے اپنی زبان مبارک سے مسلسل اللہ کے بندوں کو اللہ کا پیغام پہنچانے کا سلسلہ جاری رکھا اور آج بھی آپ کی زبانِ مبارک سے نکلے ہوئے الفاظ احادیث کی صورت میں ہمارے پاس موجود ہیں۔ سرکارِ دوعالم ﷺ کے بعد صحابہ کرام اللہ کے بندوں کو اللہ کی طرف بلانے کے لیے دنیا میں پھیل گئے اور مخلوق تک خالق کا پیغام پہنچایا۔ ان کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے تابعین، تبع تابعین، علماے ربانیین و صالحین بھی اپنے اپنے منصب اور صلاحیت کے مطابق نیکی کی دعوت میں مصروف رہے۔

حضرت سیدنا مالک بن دینار رحمۃ اللہ علیہ نے ایک یہودی کے مکان کے قریب کرائے پر مکان لے لیا اور آپ کا حجرہ یہودی کے دروازے سے متّصل تھا۔ یہودی نے ایک ایسا پرنالہ بنوایا جس کے ذریعے گندگی آپ رحمۃ اللہ علیہ کے مکان پر ڈالتا رہتا اور آپ کی نماز کی جگہ ناپاک ہو جایا کرتی۔ بہت عرصہ تک وہ یہ عمل کرتا رہا لیکن آپ نے شکایت نہیں کی۔ ایک دن اس یہودی نے خود ہی آپ رحمۃ اللہ علیہ سے عرض کی: میرے پرنالے کی وجہ سے آپ کو کوئی تکلیف تو نہیں؟ آپ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: پرنالے سے جو غلاظت گرتی ہے اس کو جھاڑو لے کر روزانہ دھوڈالتا ہوں۔ یہودی نے عرض کی: اتنی اذیت برداشت کرنے کے بعد بھی کبھی آپ کو غصہ نہیں آیا؟ فرمایا: خدائے تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور غصہ پینے والے اور لوگوں سے درگزر کرنے والے اور نیک لوگ اللہ کے محبوب ہیں۔ (آل عمران:134)

یہ سن کر وہ یہودی بہت متاثر ہوا اور یوں عرض گزار ہوا کہ یقیناً آپ کا مذہب بہت عمدہ ہے کیوں کہ اس میں دشمنوں کی اذیتوں پر صبر کرنے کو اچھا کہا گیا ہے۔ آج میں سچے دل سے اسلام قبول کرتا ہوں۔ (تذکرۃ الاولیاء:52)

عدل و انصاف کی علم برداری: مسلمانوں کی تیسری مستقل ذمہ داری یہ ہے کہ جہاں ان کی حکمرانی ہو وہاں وہ عدل و انصاف قائم کریں۔ کیوں کہ حق کی حمایت، باطل کی بیخ کنی، ظلم کی مذمت، مظلوم کی دادرسی اور ظالم کی سرکوبی یہ مومنوں کے اعلیٰ ترین اوصاف سے بھی ہیں۔ یہ تو اقتدار کی صورت میں ہے اور جہاں ان کی حکمرانی نہ ہو وہاں وہ صاحب اقتدار طبقہ سے عدل

وانصاف کا مطالبہ کرتے رہیں۔ اس کے لیے دستوری طور پر تحریکیں بھی چلاتے رہیں اور ظالموں کے سامنے کلمۂ حق کہنے میں کسی طرح کے پس و پیش میں نہ رہیں۔ حضرت ابو موسیٰ اشعری اور ان کی قوم کے دو شخص حضورِ اقدس ﷺ کے پاس حاضر ہوئے ایک نے کہا: یارسول اللہ (ﷺ)! مجھے قاضی بنا دیجیے اور دوسرے نے بھی ایسا ہی کہا۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ہم اس کو قاضی نہیں بناتے جو اس کا سوال کرے اور نہ اس کو جو اس کی حرص رکھے۔ (بخاری شریف: (456/05)

حضور اقدس ﷺ نے فرمایا: قاضی تین قسم کے ہوتے ہیں: دو جہنمی، اور ایک جنتی۔ ایک وہ جو جان بوجھ کر ناحق فیصلے کرے وہ جہنمی ہے۔ دوسرا جو نہ جانتا ہو اور لوگوں کے حقوق برباد کر دے وہ بھی جہنمی ہے اور تیسرا وہ قاضی ہے جو حق کے ساتھ فیصلے کرے وہ جنتی ہے۔ (مسند احمد: (35/09)

دنیا کے نظام کو احسن انداز سے چلانے اور حسنِ معاشرت قائم رکھنے کے لیے اسلام کے دیے گئے نظام کا ایک بہت ہی اہم حصہ عدل و انصاف ہے۔ عدل و انصاف معاشرے کو امن و امان فراہم کرنے اور لوگوں کو ایک دوسرے کے ساتھ ظلم و زیادتی کرنے سے روکنے کا بہترین ذریعہ ہے جس کی بدولت کوئی بھی شخص کسی دوسرے پر ظلم و زیادتی کرنے اور اس کی مال و جان کو نقصان پہنچانے سے گریز کرتا ہے۔ دنیا میں کئی عدل و انصاف کے دعوے دار آئے اور انھوں نے اپنی طرف سے مختلف قسم کے اصول و ضوابط قائم کیے۔ ان سے فائدہ تو ضرور ہوا لیکن مکمل طور پر ان جرائم پر کنٹرول پانے میں ناکام رہے۔ بعض تو اپنے اصولوں کی کمزوری اور بعض کسی دوسرے خارجی پہلو سفارش یا پھر کسی دباؤ اور لالچ میں آکر ان میں ناکام دکھائی دیے لیکن جب حضورِ اقدس ﷺ کی تشریف آوری ہوئی تو آپ نے ان تمام ظالمانہ نظام کا خاتمہ کیا اور ان کے مدمقابل ایسا بہترین اور زبردست قسم کا نظام متعارف کروایا کہ بڑے بڑے مجرم اور جرائم پیشہ افراد بھی اس کے سامنے سرنگوں ہونے پر مجبور ہوگئے اور لوگ اس آفاقی نظام اور اس کی مضبوط دیواروں کو تسلیم کیے بغیر نہ رہ سکے اور آج بھی اگر دنیا میں کوئی مضبوط عدل و انصاف کا نظام ہے تو حقیقی طور پر یہی اسلامی نظام ہے۔

خیر کی طرف بلانا اور شر سے باز رکھنا: مسلمانوں کی چوتھی مستقل ذمہ داری یہ ہے کہ وہ ہر حال میں بلا امتیاز مذہب و ملت تمام انسانوں کو خیر کی طرف بلائیں شر سے باز رکھیں۔ معروف یعنی بھلائی کا حکم دیں اور منکر یعنی برائی سے منع کریں۔ اگر ان کے پاس قوت نافذہ ہو تو وہ بذریعہ طاقت و قوت برائیوں کا قلع قمع کریں۔ قوت نافذہ نہ ہو تو سماجی و معاشرتی اثر و رسوخ کو استعمال کرتے ہوئے زبان سے شر کو دفع کریں۔ بہر صورت امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہر فرد امت کی ذمہ داری ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”خبردار تم میں سے ہر ایک ذمہ ہے اور تم میں سے ہر ایک سے اس کی ذمہ داری کے بارے میں سوال کیا جائے گا“۔ (مشکوٰۃ شریف)

دوسری جگہ اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”تم میں سے جو کوئی کسی برائی کو دیکھے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اسے ہاتھ سے روکے اور اگر اس کی طاقت نہ ہو تو زبان سے روکے اور اگر اس کی بھی طاقت نہ ہو تو کم از کم اسے دل میں برا جانے اور یہ ایمان کا ادنیٰ درجہ ہے“۔ (مشکوٰۃ شریف)

حقیقی اسلامی معاشرہ وہی ہے جس میں لوگ ایک دوسرے کی راحت و آرام کا خیال رکھیں، مشکل وقت میں دوسروں کے کام آئیں، کسی کو تکلیف نہ دیں اور اپنے باہمی تعلقات ملنساری، حسن اخلاق اور خیر خواہی پر استوار کریں۔ اسلام انھی چیزوں کا درس دیتا ہے اور معاشرے میں نرمی، محبت، شفقت اور ہمدردی کے جذبات پروان چڑھاتا اور معاشرے کو نقصان پہنچانے والے امور مثلاً بے جا شدت اور ایذا رسانی سے منع کرتا ہے۔ آپس میں اچھے تعلقات اور صلح صفائی سے زندگی گزارنا اسلام کے بنیادی مقاصد میں سے ہے۔ جب کہ یہ بات واضح ہے کہ لوگوں کے حقوق ضائع کرکے اور انھیں تکلیف پہنچا کر کبھی اچھے تعلقات قائم نہیں کیے جاسکتے۔ حدیث پاک میں ہے: ”تم لوگوں کو (اپنے) شر سے محفوظ

رکھو یہ ایک صدقہ ہے جو تم اپنے نفس پر کروگے"۔(بخاری:150)

ایک دوسری روایت میں ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے سوال کیا: کیا تم جانتے ہو کہ مسلمان کون ہے؟ انھوں نے عرض کی: اللہ اور اس کا رسول ﷺ زیادہ جانتے ہیں۔ ارشاد فرمایا: "مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے (دوسرے) مسلمان محفوظ رہیں۔" ارشاد فرمایا: تم جانتے ہو کہ مومن کون ہے؟ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے عرض کی: اللہ اور اس کا رسول ﷺ زیادہ جانتے ہیں۔ ارشاد فرمایا: "مومن وہ ہے جس سے ایمان والے اپنی جانیں اور اموال محفوظ سمجھیں۔" (مسند احمد:654)

دوسروں کو تکلیف دینا قبیح جرم اور کبیرہ گناہ ہے۔ لیکن معاشرے میں اسلام کا یہ خوب صورت حکم جس طرح پس پشت ڈالا گیا وہ شرم ناک حد تک قابل افسوس ہے۔

سیاسی نصب العین: قرآن و احادیث کی مقرر کردہ ان مستقل ذمہ داریوں کی روشنی میں بھارت کے مسلمانوں کا سیاسی نصب العین یعنی ان کی سیاست کے مندرجہ ذیل اغراض و مقاصد ہوسکتے ہیں۔

اپنے دین و شریعت پر قائم رہنے کی آزادی کو برقرار رکھنا اور اس معاملے میں حائل رکاوٹوں کو دور کرنا۔ اظہار رائے اور مذہبی تبلیغ و ثقافت کے تحفظ کے دستوری و قانونی حق کو برقرار رکھنا۔ ہر حال میں مسلم پرسنل لاء کا تحفظ، آئین ہند میں اقلیتی حقوق کا تحفظ، دارالقضاء کے لیے قانونی اختیارات کا حصول تاکہ مسلمانوں کے عائلی مسائل کا تصفیہ کیا جاسکے۔ ملک کی آبادی میں تناسب کے لحاظ سے اقتدار میں شراکت و حصہ داری کا مطالبہ کرنا اور اس کے لیے پرامن تحریکیں چلانا اور تمام تر سیاسی ذرائع کا استعمال کرنا۔ ادارہ ہائے قانون ساز میں شرکت و حصہ داری کا مطالبہ۔ ملک میں رونما ہونے والے آئے دن فرقہ وارانہ فسادات کے خاتمہ کے لیے مؤثر اقدامات کرنا اور فساد زدگان کی بازآبادکاری کے لیے متعلقہ حکومت اور مرکزی حکومت سے مطالبہ کرنا۔ عدل و انصاف کے قیام اور ظلم و بربریت کے استیصال کے لیے جدوجہد کرنا اور اس کے لیے تمام وسائل کو استعمال کرنا۔ پورے ملک میں نیکیوں کو پروان چڑھانا اور برائیوں کو دور کرنا۔ عام شہریوں کے فلاح و بہبود کے لیے کوشش کرنا۔ اردو کو اس کا جائز مقام دلانا اور اسکولوں کالجوں میں اُردو عربی زبان کی بھی تعلیم کے لیے ضروری سہولیات کا مطالبہ کرنا تاکہ ان میں تعلیم حاصل کرنے والے باذوق مسلم طلبہ اردو اور عربی زبان سے بھی ضروری واقفیت حاصل کرسکیں۔ اس قسم کے اور بھی بہت سے اغراض و مقاصد متعیّن کئے جاسکتے ہیں۔

نصب العین کے حصول کے لیے ضروری کام:

سب سے پہلا مرحلہ ان وسیع ترین اغراض و مقاصد کی تشہیر و اشاعت کا ہے تاکہ مسلمانوں کے ساتھ ساتھ دیگر برادرانِ وطن بھی ہمارے انسانی فلاح و بہبود کے ان عظیم مقاصد سے واقف ہوجائیں اور ان کی خوبیاں اجاگر ہوجائیں۔ اس کام کے لیے ہمیں تمام تر میڈیائی و ٹیکنالوجی ذرائع کو استعمال کرنا ہوگا۔ دوسرا مرحلہ ان مقاصد کے حصول کا ہے اس کے لیے فکری تبلیغ سے لے کر عملی سیاست تک وہ تمام کام کرنے ہوں گے جو ہماری کامیابی کے لیے ممد و معاون ثابت ہوں۔ اگر ہم ان مقاصد کے حصول میں کامیاب ہوگئے تو نہ صرف یہ کہ ہماری جہت ترقیوں کی راہیں ہموار ہوجائیں گی بلکہ پورے ملک سے سماجی و معاشرتی ناہمواریوں اور طبقاتی و گروہی ناانصافیوں کا بھی خاتمہ ہوجائے گا اور عام انسانی فلاح و بہبود کے بھی دروازے کھل جائیں گے۔ مذہب مہذب اسلام اسی طرح کے تکثیری سماج کی تشکیل چاہتا ہے کیونکہ اسلام فروغ انسانیت کی خاطر ایک طرف وسیع ترین پیمانے پر رائے عامہ ہموار کرنا چاہتا ہے اور دوسری جانب اقدام و عمل کے ذریعے پورے ماحول کو درست کرنا اور رکھنا چاہتا ہے۔ چنانچہ صحافت ہو کہ ادب، طلبہ و اساتذہ کا مسئلہ ہو کہ کسان و مزدور کا، انتظامہ میں شراکت داری ہو کہ ادارہ ہائے قانون ساز میں نمائندگی، ممبر و محراب ہو کہ میدان و بازار یا دائرہ روزگار و کاروبار انسانی زندگی کا کوئی ایسا گوشہ نہیں ہے جس میں حق کی گواہی کی تاکید اسلام نہ کرتا ہو۔ ■■■

یادِ ماضی

ہجرتوں کا سنگم:
وسطی ایشیا کی تاریخ اور مسلم ورثہ

مہتاب پیامی

وہ خطہ جسے آج دنیا وسطی ایشیا کے نام سے جانتی ہے اصل میں پانچ آزاد جمہوری ریاستوں پر مشتمل ہے: ازبکستان، قازقستان، کرغیزستان، ترکمانستان اور تاجکستان۔ یہ ساری ریاستیں کبھی سوویت یونین کے ماتحت تھے اور 1991ء میں سوویت نظام کے انہدام کے بعد انھوں نے آزادی کو دریافت کیا۔ مگر یہ آزادی اصل میں ایک بڑی ذمہ داری اور صدیوں کی آزمائش بن کر ان کے سامنے آئی۔ آزادی کے بعد ان ریاستوں کو ایک ایسی تیز رفتار آبادی، ایسی کمزور اور ناپختہ انتظامی مشینری ورثے میں ملی جو اپنی نئی زندگی کا بار اٹھانے کے قابل نہ تھی۔

جب یہ خطے سوویت یونین کا حصہ تھے تو انھیں نہ سیاسی عدمِ تحفظ کا اندیشہ تھا، نہ معاشی ابتری کا اور نہ ہی کسی قسم کے سماجی اضطراب کا۔ گویا وہ ایک بڑے درخت کے سائے میں تھے جہاں نہ ان پر کسی طوفانی بارش کا اثر ہو سکتا تھا نہ جلد کو جھلساتی ہوئی دھوپ ان پر اثرانداز ہو سکتی تھی۔ سوویت عہد میں یہ خطے ترقی کے دریا سے سیراب ہو رہے تھے، اس لیے یہ خود سوویت یونین کے ٹوٹنے کے خلاف تھے۔ مگر جب وہ درخت جڑ سے اکھڑ گیا تو یہ خطے بے سایہ ہو گئے۔ گویا ایک طوفان آیا اور سب کچھ تہس نہس کر گیا۔

گزشتہ دو دہائیوں سے وسطی ایشیائی قیادت کو طرح طرح کے طوفانوں سے دوچار ہونا پڑا: سیاسی تحفظ، سرحدی تحفظ، ماحولیاتی تحفظ، توانائی کا تحفظ، ہر سمت نئے زخم اور نئے اندیشے۔ اس اچانک زوال کے بعد شفا پانے کے لیے ان ریاستوں نے سوویت تاریخ کو پسِ پشت ڈالنے کی کوشش کی اور اپنے قدیم ثقافتی اور مذہبی ورثے کو سہارا بنایا۔ اپنی شناخت کو زندہ رکھنے کے لیے وہ دوبارہ اپنے مسلم ماضی کی طرف متوجہ ہوئیں۔

دیکھا جائے تو وسطی ایشیا کا خطہ ہمیشہ ہجرتوں کا سنگم رہا ہے: ترکوں کا قافلہ، ایرانی تہذیب کا جادو، اسلام کی روشنی، یونانی اثرات کی بازگشت اور کبھی کبھی چینی قدموں کی چاپ۔ لیکن یہاں سب سے گہرا اور سب سے پائیدار رنگ ترک اور اسلامی تہذیب کا ہی رہا۔ یہی سبب ہے کہ اس سرزمین کو ماضی میں ترکستان کہا جاتا تھا۔

وسطی ایشیا ہمیشہ سے بڑی طاقتوں کے کھیل کا میدان رہا ہے۔ اس کی جغرافیائی حیثیت نہ صرف اس کے ماضی کے خدوخال کو تراشتی رہی ہے بلکہ آج کی نسلی اور سیاسی صورتِ حال پر بھی اس کے اثرات محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ روسی یلغار کے بعد اس خطے کی جغرافیائی سرحدیں بھی روسی مفادات کے مطابق کھینچی گئیں۔

یوں موجودہ وسطی ایشیا کا ہر منظر، ہر خواب اور ہر سوال اپنے ماضی کی کسی نہ کسی داستان کا تسلسل ہے، جہاں ترکستان کی صدا آج بھی گونجتی ہے اور اسلام کی روحانی ہوا اب بھی ان کے اجتماعی وجود کو سانسیں فراہم کر رہی ہے۔

تاریخی اعتبار سے قازقستان کو شمال مغربی ایشیا کا حصہ سمجھا جاتا تھا، جب کہ افغانستان اور ایران کے شمالی خطے مثلاً خراسان کو وسطی ایشیا کی سرزمین میں شامل مانا جاتا رہا۔ مگر آج جسے

payamee@gmail.com/Contact:9235647041

ہم وسطی ایشیا کہتے ہیں، اس کی موجودہ جغرافیائی تعریف اس خطے کی ثقافتی جغرافیہ سے مطابقت نہیں رکھتی۔ مثال کے طور پر:

◘ وسطی ایشیا کی جنوبی ریاستیں، یعنی تاجکستان اور ازبکستان، اپنی روحانی اور تہذیبی فضا میں زیادہ تر ایرانی و اسلامی ثقافت کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ ان کی فکری اور نظریاتی وابستگیاں اپنے جنوبی ہمسایوں سے ہیں نہ کہ قازقستان اور کرغیزستان سے۔

◘ قازقستان پر چین اور روس کے واقعات زیادہ اثر انداز ہوتے ہیں بہ نسبت افغانستان یا ایران کے۔

◘ اسی طرح ترکمانستان کی فضاؤں پر پاکستان اور افغانستان کی آندھیاں زیادہ گہرا اثر ڈالتی ہیں۔

یوں کہا جا سکتا ہے کہ یہ خطہ ایک ایسے کاغذ کی مانند ہے جس پر تاریخ کے ہر حادثے نے اپنی من چاہی لکیر کھینچی اور ہر تہذیب نے اپنی چھاپ چھوڑ دی، اور انھی نقوش نے آج کے وسطی ایشیا کی شناخت کو تراشا۔

وسطی ایشیا کی یہ سرزمین تین ہزار برس سے زیادہ عرصے سے انسانی قافلوں اور تہذیبی ہجرتوں کی گزرگاہ رہی ہے۔ یہ خطہ کبھی بازارِ دنیا رہا ہے جہاں قدیم دنیا کی عظیم تہذیبیں ایک دوسرے سے ملیں، تجارت کے کارواں رکے، اور خیالات و عقائد کا تبادلہ ہوا۔ یہاں ایران کی باریک بینی اور فکری گہرائی بھی ہے اور یونانی فلسفۂ دانش بھی، یہاں ہند کی روحانی میراث بھی ہے اور چین کی حکمت و صنعت بھی اور ان سب سے بڑھ کر اسلام کی نورانی تہذیب بھی ہے۔ یہ سارے عوامل اس خطے کے کاسۂ دل میں گھل مل کر ایک منفرد رنگ پیدا کرتے رہے ہیں۔

مگر روس کی ظالمانہ یلغار نے اس خطے کو مجروح کیا، اس نے یہاں کے سماجی جڑوں کو کاٹا، اقتصادی بنیادوں کو ہلایا، اور سیاسی ڈھانچوں کو مسخ کیا، اس نے ان اقوام کو ان کی ترک و ایرانی تہذیبی بنیادوں سے کاٹ کر ایک ایسے سوویت ورثے کی جانب منتقل کیا جو اُن کی اپنی روح سے بیگانہ تھا۔ اور جب سوویت اتحاد کا سورج غروب ہوا، تو یہ ریاستیں ایک ایسے بیابان میں تنہا کھڑی رہ گئیں جہاں نہ سایہ دار درخت تھے، نہ محفوظ چھاؤں۔ انھیں اپنی تقدیر خود لکھنی پڑی اور اپنی شناخت خود وضع کرنی پڑی۔

تاریخ کے آئینے میں دیکھا جائے تو وسطی ایشیا کے باشندے زیادہ تر خانہ بدوشی کی زندگی گزارتے تھے، ان کی گزر بسر شاہراہِ ریشم (Silk Road) کی مرہونِ منت تھی۔ یہی سبب ہے کہ یہ خطہ صدیوں تک ایک ایسا چوراہا رہا جہاں یورپ، مغربی ایشیا، جنوبی ایشیا اور مشرقی ایشیا سب آپس میں گلے ملتے رہے۔ اسلام سے قبل اور اوائلِ اسلام میں اس خطے پر ایرانی تہذیب کا غلبہ تھا۔ یہاں دو قسم کے لوگ بستے تھے:

(۱) خانہ بدوش ترک قبائل۔ اور

(۲) مستقل سکونت رکھنے والے لوگ جن میں ایرانی (تاجک) اور ترک (ازبک، قرہ قلپاق وغیرہ) شامل تھے۔

زاری حکومت کے ماہرینِ بشریات نے اس مقیم آبادی کو "سارت" لفظ سے یاد کیا ہے۔ یہ ایک ایسا لفظ جس کی نہ کوئی واضح جڑ ہے اور نہ کوئی معین معنیٰ، مگر انھوں نے اس پر نسلی اور لسانی دلالت کا بوجھ ڈال دیا۔ ان کے نزدیک یہ لفظ تاجک (ایرانی نسل) باشندوں اور ان پر غالب آنے والے ازبک (ترکی نسل) فاتحین کے باہمی تعلق کو ظاہر کرتا تھا۔ مگر حقیقت یہ تھی کہ "سارت" کہلانے والے خود کو کسی خاص نسل یا قوم کا فرد نہیں سمجھتے تھے، بلکہ بس "مسلمان" جانتے تھے۔

چھٹی صدی سے مغرب کی جانب سے ترک قبائل کی یلغاروں کے سبب مذکورہ خانہ بدوشوں میں ترکیت کی چھاپ گہری ہوئی، اس نسبت سے یہ خطہ ترکستان کہلایا۔ تیرہویں صدی میں ترک قبائل (قازق چرواہوں) نے وسطی ایشیا کے کئی شہر اجاڑ دیے اور اس طرح مقامی بستیوں پر ترک اثرات اور بھی بڑھ گئے۔ آج صرف تاجک وہ واحد قوم ہے جسے خالصتاً ایرانی نسل کا

تسلسل مانا جاسکتا ہے، اور اس کی دلیل ان کی زبان ہے جو فارسی (ایران وافغانستان) سے نہایت قریب ہے۔

ازبک ترک، سوویت یونین میں سب سے بڑی ترک قوم تھے اور دنیا میں بھی ترکیہ کے ترکوں کے بعد سب سے بڑی ترک نسل سمجھی جاتی ہے۔

پانچویں اور چھٹی صدی تک ترکوں نے جنوبی وسطی ایشیا میں جگہ بنالی تھی، جسے اس سے قبل ساسانی سلطنت نے روک رکھا تھا۔ پھر آٹھویں صدی میں عربوں کی یلغار نے ترکوں کی آمد کے دروازے کھول دیے۔ دسویں صدی کے اواخر میں سامانی سلطنت نے وسطی ایشیا کو اپنے زیرِ نگیں کر لیا اور بخارا اور سمرقند جیسے شہران کے زیرِ سایہ آ گئے۔ سامانیوں نے ہی فارسیِ نو کو بطور ایک مکمل اسلامی زبان پروان چڑھایا۔

اگرچہ عربوں نے زمین داری اور انتظامی ڈھانچوں پر گہرا اثر ڈالا، لیکن ثقافتی میدان میں فارسی کا رنگ زیادہ غالب رہا اور آج تک باقی ہے۔ ترک بولنے والے خانہ بدوش زیادہ تر گھاس کے میدانوں کی سرحدوں پر رہے۔ دسویں صدی سے کئی خانہ بدوش اسلام کی راہ پر چلتے ہوئے مشرقِ وسطیٰ کی طرف ہجرت کرنے لگے، مگر حقیقی طور پر ان کا اسلام میں داخل ہونا اٹھارویں صدی میں مکمل ہوا۔

سامانی سلطنت کے بعد تیرہویں صدی وسطی ایشیا کی تاریخ کا سب سے بڑا صدمہ لے کر آئی۔ غیر مسلم خانہ بدوش قبائل (منگولوں) نے وسطی ایشیا پر یلغار کی اور شہروں کو جلا کر خاک کر دیا۔ سب سے زیادہ تباہی مسلمانوں کو سہنی پڑی۔ معاصر مؤرخ ابن الاثیر لکھتے ہیں کہ چنگیز خان کی فوجوں نے وسطی ایشیا کو ایسی بربادی میں ڈالا جیسی تاریخ نے پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔ منگولوں نے نہ صرف جسمانی و سیاسی تباہی پھیلائی بلکہ ثقافتی و مذہبی ڈھانچوں کو زمین بوس کر دیا اور اسلامی اخلاقی اقدار کو منگول ضابطۂ حیات کے تابع کر دیا گیا۔ منگولوں نے اپنا قانون "یاسا" نافذ کیا، جو اسلامی شریعت کے متوازی تھا۔ یوں اسلام کی بالادستی منگول طاقت کے نیچے دب گئی۔

پندرہویں صدی تک مختلف صوفی بزرگوں کے ظہور نے اسلام کو دوبارہ وسطی ایشیا میں زندہ کیا۔ ان میں خاص طور پر نقشبندیہ اور کبرویہ سلسلے کے مشائخ نمایاں ہیں جنھوں نے پورے خطے میں دینِ اسلام کی تعلیمات پھیلائیں۔ چودھویں اور پندرہویں صدی کے بعد تو منگول حکمراں بھی ترک رنگ میں رنگ گئے اور انھوں نے اسلام قبول کر لیا، کیوں کہ ان کی افواج زیادہ تر مقامی ترکوں پر مشتمل تھیں۔ اس طرح خطہ رفتہ رفتہ منگول رسوم و رواج کے اثر سے نکل گیا۔ آخری منگول سلطنت یعنی تیموری سلطنت نے اسلامی فنون اور ثقافت کو وسطی ایشیا میں ایک نئی جِلا بخشی اور اس خطے کی روحانی و تہذیبی شناخت کو از سر نو پروان چڑھایا۔

زار شاہی اور سوویت دور:

منگولوں کے بعد وسطی ایشیا پر جو آخری بڑی یلغار ہوئی وہ روسی یلغار تھی، جو زار شاہی کے زیرِ سایہ شروع ہوئی اور پھر سوویت دور تک جاری رہی۔ روسیوں نے 1865ء میں تاشقند (جو اس وقت ترکستان کا قلب تھا) کی دیواریں توڑ کر وسطی ایشیا پر قبضہ جمایا۔ وہ رفتہ رفتہ خطے کے جنوبی حصوں کی طرف بڑھتے گئے اور سب سے پہلے قازقستان کو اپنے پنجۂ استبداد میں قید کیا، پھر وہاں سے پورے وسطی ایشیا تک اپنی گرفت بڑھائی۔ اس سے قبل خطے پر اسلام کی فکری و روحانی بالادستی تھی، مگر روسی اقتدار نے وقت کے ساتھ ساتھ مذہبی اور تہذیبی منظر نامہ ہی بدل ڈالا۔ روسی حکومت نے سماجی و سیاسی ڈھانچے میں نئی پالیسیوں کا نفاذ کیا، اور مذہب کی صورتِ حال کو یکسر بدل دیا۔ اس طرح وسطی ایشیا نوآبادیاتی دنیا کے حصے کے طور پر جدیدیت میں داخل کیا گیا۔

زار شاہی کے زمانے میں مذہبی پالیسی کچھ نرم تھی۔ انھوں نے خطے میں سائنس و ٹیکنالوجی، تعلیم، ریل، تار برقی

(ٹیلی گراف) جیسے مظاہر متعارف کروائے۔ ان کا طریقہ کار یہ تھا کہ وہ اسلام کو نظر انداز کر کے یہ سمجھتے تھے کہ بغیر ریاستی حمایت کے اسلام رفتہ رفتہ خود ہی کمزور پڑ جائے گا۔ روسی اصل میں خطے کے قدرتی وسائل پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ اس لیے وہ اسلام کی شدت پسندی کو کمزور کرنے کے لیے "غفلت کی پالیسی" اپنائے ہوئے تھے۔ اسی دوران روسیوں کی لائی ہوئی جدیدیت نے ایک نئی فکری لہر کو جنم دیا جسے جدیدازم کہا جاتا ہے۔ اس تحریک کے رہنما وہ دانشور تھے جو اسلام کی نئی تعبیر اور اصلاح کے خواہاں تھے۔ انھوں نے جدید تعلیم کو اسلام کے ساتھ جوڑ کر یہ باور کرایا کہ یہ تعلیم ہی مسلمانوں کو زمانے کے تقاضوں سے ہم آہنگ کر سکتی ہے اور ان کی بقا کا ذریعہ ہے۔ یہ تحریک دراصل اصولِ جدید یعنی نئی تعلیمی بنیادوں پر استوار تھی۔

ان جدیدیوں نے اسلام کو روایتی رسوم و رواج سے الگ کر کے اسے سیاسی و معاشی بنیادوں سے وابستہ کیا۔ ان کے انقلابی نظریات نے روسی حکام کو تشویش میں ڈال دیا کیوں کہ یہ نوآبادیاتی اقتدار کے لیے خطرہ بنتے جا رہے تھے۔

1917ء میں روسی انقلاب برپا ہوا اور زار شاہی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ اس کے بعد بولشویکوں نے سوویت یونین قائم کیا اور وسطی ایشیا کو اس میں ضم کر دیا۔ نئی سرحدیں خالصتاً سوویت سیاسی و معاشی مفادات کے مطابق طے کی گئیں۔ بولشویکوں نے مارکس ازم کو بنیاد بنایا، جس کا مقصد طبقاتی نظام کا خاتمہ اور، یکساں سوشلسٹ معاشرہ تشکیل دینا تھا۔ سوشلزم میں نسل، قومیت اور کوئی طبقاتی تفریق باقی نہیں رہتی۔ لہٰذا قوم پرستی، جو زمین، تاریخ، ثقافت اور نسلی بنیادوں پر قائم ہوتی ہے سوشلسٹ فکر میں ناقابلِ قبول تھی۔ اسی معاملے میں سوویت پالیسی نہایت سخت تھی۔ اسلام اور اس سے وابستہ تحریکیں، مثلاً "پان اسلامزم، جدیدیت اور ترکستانی تحریک" روسی اقتدار کے لیے بڑا خطرہ سمجھی گئیں۔ بولشویکوں نے اسلام کو "پسماندگی" سے تعبیر کیا اور اسے ترقی کی راہ میں رکاوٹ مانا۔ ان کے نزدیک کسی ملک کی سماجی و معاشی ترقی کے لیے مذہب سے آزادی لازمی شرط تھی۔

سوویت حکمرانوں نے اسلام اور روایتی رسوم پر سخت پابندیاں عائد کر دیں، مساجد بند کر دی گئیں، 1920ء میں ثقافتی انقلاب برپا ہوا جس نے دینی تعلیم کو نشانہ بنایا، جدید اسکول قائم کیے گئے جہاں جدید تعلیم دی جاتی، ناخواندگی کے خلاف مہم شروع ہوئی، ترکی الاصل زبانوں کے بجائے لاطینی رسم الخط رائج کیا گیا، عورتوں کو پردہ ترک کرنے پر مجبور کیا گیا اور انھیں مزدوری پر لگایا گیا، نیز تنہائی کی پالیسی (Isolationism) اپنائی گئی جس نے وسطی ایشیا کا رابطہ باقی مسلم دنیا سے توڑ ڈالا۔ یہ ساری چیزیں خطے کے مذہبی اور تہذیبی ڈھانچے پر ایک کاری ضرب تھی۔

مگر ان سب کے باوجود دین اسلام انڈر گراؤنڈ حالت میں پھر بھی زندہ رہا۔ اسے "غیر سرکاری اسلام" یعنی (Unofficial Islam) کہا گیا۔ لوگ گھروں میں عبادات کرتے، خفیہ مساجد قائم ہوئیں، حتیٰ کہ چائے خانے بھی مسجد کا متبادل بن گئے۔ علاوہ صوفی سلسلوں کی خفیہ انجمنیں بھی سرگرم عمل رہیں۔

سرکاری اسلام اور سیاسی کھیل:

جب 1941ء میں جرمنی نے روس پر حملہ کیا تو اسٹالن نے مسلمانوں کی حمایت حاصل کرنے کے لیے "سرکاری اسلام" متعارف کرایا۔ ریاست کی زیرِ نگرانی مدارس کھولے گئے، چند لوگوں کو حج کی اجازت دی گئی، اور مساجد میں مقررین بھیجے گئے۔ یہ سب دراصل مسلمانوں پر قابو پانے کی ایک سیاسی حکمتِ عملی تھی۔ اس طرح زیرِ زمین اسلام اور سرکاری اسلام دونوں متوازی چلتے رہے، ایک اصلی روحانی اسلام اور دوسرا سیاسی اسلام۔

گورباچوف کا دور:

بعد ازاں گورباچوف کے دور میں گلاسناسٹ (Glasnost) یعنی "آزادی و کشادگی" کی پالیسی نے اسلام کو

دوبارہ ابھرنے کا موقع دیا۔ لوگ کھلے عام اپنے مذہب پر عمل پیرا ہونے لگے۔ اس دور میں ہزاروں مساجد تعمیر ہوئیں، اسلامی ادب کی اشاعت ہوئی، سعودی عرب سے قرآن مجید کے نسخے لائے گئے۔ اور مقامی علما اچانک عوامی رہنما بن کر سامنے آئے۔ یہ سب اس حقیقت کی غمازی کرتا ہے کہ وسطی ایشیا کے لوگوں کی روح میں اسلام کس قدر گہری جڑیں رکھتا تھا۔

سوویت دور کے بعد!!

1991ء میں جب سوویت یونین کا بت پاش پاش ہوا، تو وسطی ایشیا کی ریاستیں اچانک ایک ایسے سمندر میں اتر گئیں جہاں کنارے تھے نہ بادبان، اور ہوا کا رخ بھی نامعلوم۔ آزادی کا یہ تحفہ بظاہر ایک نئی صبح تھی، لیکن حقیقت میں یہ ایک صحرائے بے آب و گیاہ تھا جہاں انھیں اپنے قدموں کے نشانات سے راستوں اور منزلوں کی شناخت کرنی تھی۔ 70 برس کی غلامی نے ان ریاستوں کو اپنی تہذیبی اور مذہبی جڑوں سے کاٹ دیا تھا۔ مساجد اجڑی ہوئی تھیں، مدارس ویران ہو چکے تھے، اور ایمان کی صدائیں صرف گھروں اور خانقاہوں کی سرگوشیوں میں باقی تھیں۔ آزادی کے بعد پہلی بار انھیں اپنے اصل چہرے کو آئینے میں دیکھنے کا موقع ملا۔

آزادی کے فوراً بعد یہ ریاستیں ایک آزمائش میں داخل ہوئیں۔ معیشت ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھی، سرحدیں غیر یقینی عالم میں گم تھیں، سیاست نوآموز اور غیر پختہ تھی۔ مگر ان تمام بحرانات کے درمیان ان کے پاس ایک ایسی پناہ تھی جس نے صدیوں کے طوفانوں میں انھیں محفوظ رکھا تھا، وہ پناہ تھی "اسلام"۔ سوویت زوال کے ملبے سے اٹھتے ہی سب سے پہلا جذبہ یہی ابھرا کہ اپنی قومی اور سماجی شناخت کو مسلم امّت کے رنگ میں ڈھالا جائے۔

اسی پس منظر میں ہزاروں مساجد دوبارہ تعمیر ہوئیں، مدارس کے دروازے کھلنے لگے، اور قرآن کی تلاوت سرِ عام گونجنے لگی۔ عوام کے دلوں میں چھپی وہ سرگوشی جو برسوں زیرِ زمین "غیر رسمی اسلام" کے طور پر زندہ رہی، اب ایک نعرۂ تکبیر لگاتی ہوئی بیدار ہو چکی تھی۔ تاہم آزادی کا یہ سفر آسان نہ تھا۔ ان ریاستوں کو توانائی کے وسائل کے تحفظ سے لے کر سرحدی تنازعات، ماحولیاتی مسائل اور سیاسی عدم استحکام تک کئی زخم سہنے پڑے۔ مگر اس تمام درد کے باوجود ایک نئی روح پیدا ہو رہی تھی، وہ روح جو کہتی تھی کہ روسی ورثے سے نہیں بلکہ اپنے دینی اور تہذیبی میراث سے نئی شناخت بنانی ہے۔

اس طرح وسطی ایشیا نے ایک نئی تاریخ رقم کرنا شروع کی۔ ایک طرف جدید ریاستی ڈھانچوں کی تعمیر تھی، دوسری طرف صدیوں پرانی اسلامی روایت کی بازیافت۔ یہ ایک ایسا امتزاج تھا جو ماضی کے زخموں کو مرہم بھی دیتا تھا اور مستقبل کی سمت بھی متعیّن کرتا تھا۔

مآخذ:

- عباس علی عمید زنجانی، اسلامی انقلاب اور اس کی جڑیں، تہران: تہران یونیورسٹی، 1998ء۔
- سی۔ ای۔ بوسورتھ، ایرانی دنیا کی سیاسی اور سلاطینی تاریخ (عیسوی 1217-1000)۔ (ایڈیٹر: جے۔ اے۔ بوائل) دی کیمبرج ہسٹری آف ایران، جلد پنجم: کیمبرج یونیورسٹی پریس، 1968ء۔
- اقبال آشتیانی، ایران کی تاریخ، تہران: تہران یونیورسٹی پبلی کیشن، 2001ء۔
- حجنواذ، جے، اسلام کی مختصر تاریخ: اسلام کا پھیلاؤ، انٹرنیشنل جرنل آف بزنس اینڈ سوشل سائنس، ریاست ہائے متحدہ امریکا، 2013ء، جلد 4، نمبر 17، ص 213-217۔
- اے. کے. ایس. لیمبٹن، معاشرے کا انہدام: وسطی اسلامی خطے قبل از اسلام سے پہلی جنگ عظیم تک، کیمبرج یونیورسٹی پریس، 1970ء۔
- محمد رضا، ایران کے تاریخی مکتوبات، تہران: کیہان پبلیکیشنز، 1987ء۔
- رضا خضری، س، عباسی خلافت کی تاریخ ابتدا سے آل بویہ تک، تہران: سائنس اینڈ لائف پبلی کیشن، 1998ء۔
- مائیکل سکر، اسلامی دنیا کا زوال: معاہدۂ کارلووٹز سے سلطنتِ عثمانیہ کے انہدام تک، پراگر پبلیکیشنز، 2000ء۔
- سعیدیان، عبدالحسین، دنیا کے اقوام، چوتھا ایڈیشن، تہران: سائنس اینڈ لائف پبلی کیشن، 1991ء۔ ■■■

حفظان صحت

جدید میڈیکل سائنس اور انسانی صحت

ڈاکٹر انانیہ سرکار

آپ کو دو یا تین دن بخار رہا۔ اگر آپ نے کوئی دوا نہ بھی لی ہوتی، تو کچھ دنوں میں آپ کا جسم خود بخود ٹھیک ہو جاتا۔ لیکن آپ ڈاکٹر کے پاس چلے گئے۔ شروع میں ہی ڈاکٹر نے کئی ٹیسٹ لکھ دیے۔ ٹیسٹ کے نتائج میں بخار کی کوئی خاص وجہ نہیں ملی۔ البتہ، کولیسٹرول اور شوگر کی سطح تھوڑی سی زیادہ نظر آئی — جو عام لوگوں میں بہت عام ہے۔

بخار تو اتر گیا، لیکن اب آپ صرف بخار کے مریض نہیں رہے۔ ڈاکٹر نے آپ کو بتایا: آپ کا کولیسٹرول زیادہ ہے۔ شوگر بھی تھوڑی بڑھی ہوئی ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ آپ پری-ڈائیبیٹک ہیں۔ آپ کو کولیسٹرول اور شوگر کنٹرول کرنے کی دوائیں لینی پڑیں گی۔ اس کے ساتھ ہی کھانے پینے کی متعدّد پابندیاں لگ گئیں۔

ہو سکتا ہے آپ نے کھانے کی پابندیاں سختی سے نہ بھی مانی ہوں — لیکن دوائیں کھانا آپ نے نہیں بھولنا تھا۔

تین ماہ گزر گئے۔ پھر ٹیسٹ ہوئے۔ آپ کا کولیسٹرول تھوڑا کم ہوا، لیکن اب آپ کا "بلڈ پریشر" تھوڑا بڑھ گیا۔ ایک اور دوا لکھ دی گئی۔ اب آپ "تین دوائیں" کھا رہے تھے۔

یہ سب سن کر آپ کی پریشانی بڑھ گئی، اب کیا ہو گا؟ اس فکر کی وجہ سے آپ کی نیند اڑ گئی۔ ڈاکٹر نے "نیند کی گولی" لکھ دی — اور اب آپ کی دوائیں "چار" ہو گئیں۔

یہ سب دوائیں کھانے کے بعد آپ کو تیزابیت اور سینے کی جلن ہونے لگی۔ ڈاکٹر نے مشورہ دیا: کھانے سے پہلے خالی پیٹ گیس کی گولی کھا لیا کریں۔ اب آپ پانچ دوائیں کھا رہے تھے۔

چھ ماہ گزر گئے۔ ایک دن آپ کو سینے میں درد ہوا اور آپ ایمرجنسی میں پہنچ گئے۔ مکمل چیک اپ کے بعد ڈاکٹر نے کہا: اچھا ہوا آپ بروقت آ گئے۔ ورنہ سنگین ہو سکتا تھا۔ مزید ٹیسٹ تجویز کیے گئے۔ کئی مہنگے ٹیسٹ کروانے کے بعد ڈاکٹر نے بتایا: اپنی موجودہ دوائیں جاری رکھیں۔ لیکن اب دل کے لیے دو مزید دوائیں شامل کر لیں۔ نیز، آپ کو اینڈوکرائنولوجسٹ کو بھی دکھانا چاہیے۔ اب آپ سات دوائیں کھا رہے تھے۔

کارڈیالوجسٹ کے مشورے پر آپ اینڈوکرائنولوجسٹ کے پاس گئے۔ انھوں نے ایک اور شوگر کی دوا اور تھائیرائیڈ کی گولی شامل کر دی، کیوں کہ تھائیرائیڈ کی سطح تھوڑی بڑھی ہوئی تھی۔ اب آپ کی کل دوائیں "نو" ہو گئیں۔ آہستہ آہستہ آپ یہ ماننے لگے کہ آپ واقعی بیمار ہیں: * دل کے مریض * ذیابیطس * بے خوابی * گیس کے مسائل * تھائیرائیڈ کے مسائل * گردے کے مسائل ... اور فہرست جاری رہی۔

کسی نے آپ کو نہیں بتایا کہ آپ * ارادہ * خود اعتمادی اور طرز زندگی * میں تبدیلی لا کر اپنی صحت بہتر بنا سکتے ہیں۔

بلکہ آپ کو بار بار بتایا گیا کہ آپ ایک * سنگین مریض * ہیں، کمزور ہیں، ناکارہ ہیں اور ٹوٹے ہوئے انسان ہیں۔

چھ ماہ بعد، ان تمام دواؤں کے مضر اثرات کی وجہ سے آپ کو * پیشاب کے مسائل * ہونے لگے۔ مزید ٹیسٹ سے * گردوں کے مسائل * کا پتہ چلا۔ ڈاکٹر نے مزید ٹیسٹ کیے۔ رپورٹ دیکھ کر کہا: "کریٹینین کی سطح تھوڑی بڑھ گئی ہے۔ لیکن فکر نہ

کریں — جب تک آپ باقاعدگی سے دوائیں لیتے رہیں گے۔ انھوں نے *دو مزید دوائیں * شامل کر دیں۔

اب آپ * گیارہ دوائیں * کھا رہے تھے۔

اب آپ * کھانے سے زیادہ دوائیں * کھا رہے تھے، اور ان دواؤں کے مضر اثرات کی وجہ سے آپ آہستہ آہستہ * موت * کی طرف بڑھ رہے تھے۔

اگر ابتدا میں، جب آپ پہلی بار بخار کی وجہ سے ڈاکٹر کے پاس گئے تھے، ڈاکٹر نے صرف یہ کہہ دیا ہوتا:

"پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ صرف ہلکا بخار ہے۔ دوائی کی ضرورت نہیں۔ آرام کریں، زیادہ سے زیادہ پانی پئیں، تازہ پھل اور سبزیاں کھائیں، صبح کی سیر کریں — بس۔ کسی دوا کی ضرورت نہیں۔" * لیکن پھر... ڈاکٹر اور دواساز کمپنیاں اپنی روزی کیسے کماتیں؟

سب سے بڑا سوال:

* ڈاکٹر کس بنیاد پر مریضوں کو ہائی کولیسٹرول، ہائی بلڈ پریشر، ذیابیطس، دل کی بیماری یا گردے کی بیماری کا مریض قرار دیتے ہیں؟ * یہ معیارات کون طے کرتا ہے؟ آئیے اس پر تھوڑا گہرائی سے جائیں:

* * 1979 میں، شوگر کی سطح * 200mg/dl کو ذیابیطس سمجھا جاتا تھا۔ اس وقت دنیا کی صرف 3.5٪ آبادی ٹائپ 2 ذیابیطس میں شمار ہوتی تھی۔

1997 میں، انسولین بنانے والی کمپنیوں کے دباؤ میں، ذیابیطس کی حد 126 mg/dl تک گرا دی گئی، جس سے اچانک ذیابیطس کے مریضوں کی تعداد 3.5٪ سے 8٪ ہو گئی — یعنی 4.5٪ زیادہ لوگوں کو بغیر کسی اصل علامت کے ذیابیطس کا لیبل لگا دیا گیا۔

1999 میں، عالمی ادارہ صحت (WHO) نے اس گائیڈ لائن کو قبول کر لیا۔ انسولین کمپنیوں نے بھاری منافع کمایا اور مزید فیکٹریاں کھول لیں۔ 2003 میں، امریکن ڈائیبیٹز ایسوسی ایشن (ADA) نے فاسٹنگ شوگر کی سطح کو 100mg/dl تک کم کر کے پری-ڈائیبیٹک کا معیار بنا دیا۔

نتیجے میں، 27٪ لوگ بلاوجہ ذیابیطس کے زمرے میں آ گئے۔ فی الحال، ADA کے مطابق، کھانے کے بعد شوگر 140 mg/dl کو ذیابیطس سمجھا جاتا ہے۔ اس کی وجہ سے، دنیا کی تقریباً 50٪ آبادی کو اب ذیابیطس کا لیبل لگ چکا ہے — جن میں سے بہت سے واقعی بیمار نہیں ہیں۔

بھارتی دواساز کمپنیاں اسے مزید کم کر کے HbA1c 5.5٪ کرنے کی کوشش کر رہی ہیں، تاکہ مزید لوگوں کو مریض بنا کر دواؤں کی فروخت بڑھائی جا سکے۔

بہت سے ماہرین کا خیال ہے کہ HbA1c 11٪ تک کو ذیابیطس نہیں سمجھنا چاہیے۔

ایک اور مثال:

2012 میں، ایک بڑی دواساز کمپنی پر امریکی سپریم کورٹ نے 3 بلین ڈالر کا جرمانہ عائد کیا۔ ان پر الزام تھا کہ 2007–2012 کے درمیان، ان کی ذیابیطس کی دوا نے دل کے دورے کا خطرہ 43٪ تک بڑھا دیا تھا۔

کمپنی کو یہ پہلے سے معلوم تھا لیکن منافع کے لیے جان بوجھ کر چھپایا گیا۔ اس عرصے میں انھوں نے 300 بلین ڈالر کا منافع کمایا۔

* یہ آج کی "جدید ترین میڈیکل سسٹم" ہے!

* سوچیں... غور کرنا شروع کریں...

* اللہ سب کو صحت مند اور خوش رکھے — آج میری یہی دعا ہے۔

■■■■■

چراغ خانہ

القابات اور عملی مقامات؛ایک فکری تجزیہ

سلمی شاھین امجدی کردار فاطمی

انسانی معاشرے میں علمی اور فکری حیثیت کو نمایاں کرنے کے لیے مختلف القابات استعمال کیے جاتے ہیں۔ یہ القابات کسی کی علمی قابلیت، مہارت، اور تجربے کی علامت ہوتے ہیں، جیسے قاری، قاریہ، مفتی، مفتیہ، عالم، عالمہ، فاضل، فاضلہ وغیرہ۔ تاہم، سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا یہ القابات محض نام کے ساتھ لگانے سے حقیقی علم اور مہارت کا ثبوت بن جاتے ہیں، یا اصلی علم عملی میدان میں ثابت قدمی اور مہارت ہے؟

القابات کا استعمال اور ان کی حدود:

ہر وہ شخص جو کسی خاص علمی یا فقہی مقام پر فائز ہو، وہ اپنے نام کے ساتھ وہ لقب ضرور لگا سکتا ہے/لگا سکتی ہے جو اس کے مرتبے کی ترجمانی کرے۔ ایک قاری یا قاریہ وہ کہلاتا ہے جو تجوید و قراءت میں مہارت رکھتا ہو، مفتی وہ ہوتا ہے جو شرعی مسائل میں اجتہادی بصیرت رکھتا ہو، عالم اور عالمہ وہ ہوتے ہیں جس نے علومِ دینیہ میں گہری سمجھ بوجھ حاصل کر لیا ہو۔ اگر کوئی شخص واقعی ان میں مہارت رکھتا ہے تو اس کے لیے ان القابات کو استعمال کرنا جائز ہی نہیں، بلکہ بعض مواقع پر ضروری بھی ہو سکتا ہے تاکہ لوگ ان کی علمی حیثیت سے واقف ہو سکیں اور ان سے صحیح رہنمائی حاصل کر سکیں۔

لیکن کیا ہر وہ شخص جو ایک خاص دینی تعلیم حاصل کر لیتا ہے، وہ فوراً اپنے نام کے ساتھ یہ القابات لگا لے؟ یہی وہ سوال ہے جس پر ہمیں سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے۔

القابات اور حقیقی مہارت میں فرق:

میرا ذاتی رجحان اس حوالے سے یہ ہے کہ جب تک کوئی شخص کسی فن میں مہارتِ تامہ حاصل نہ کر لے، اسے ان القابات کے استعمال میں محتاط رہنا چاہیے۔ مجھے یاد ہے کہ میری ایک استاذہ، جو عرب دنیا سے تعلق رکھتی ہیں۔ جن کا نام رانیا الحلبیہ ہے انھوں نے ایک بار مجھ سے پوچھا کہ کیا آپ قاریہ ہیں؟ میں نے اثبات میں جواب دیا اور بتایا کہ میں نے ایک سے ڈیڑھ سال کے اندر قراءت مکمل کر لی تھی۔

اس پر انھوں نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ میں 17 سال سے علم قراءت کا مطالعہ کر رہی ہیں، اور عربی زبان میری مادری زبان ہے، اور اس کے باوجود میرے اساتذہ نے مجھے تاحال "قاریہ" کا لقب دینے سے گریز کیا ہے۔

یہ واقعہ میرے لیے ایک لمحۂ فکریہ بنا۔ میں نے محسوس کیا کہ ہمارے یہاں القابات کو صرف نصاب مکمل کرنے کا نتیجہ سمجھ لیا گیا ہے، جب کہ اصل معیار کسی فن میں کمال حاصل کرنا ہوتا ہے۔

نبی کریم ﷺ کے زمانے میں "قاری" اس شخص کو کہا جاتا تھا جو قرآن کریم کے الفاظ کے ساتھ اس کے معانی، شانِ نزول، اور مضامین پر بھی مکمل عبور رکھتا ہو۔

آج اگر ہم اس معیار کو دیکھیں تو شاید ہم میں سے بہت کم لوگ اس لقب کے صحیح مستحق ہوں گے۔

عملی نمونہ زیادہ مؤثر ہے:

میرا نظریہ یہ ہے کہ اگر ہم واقعی کسی علمی درجے پر پہنچ چکے ہیں تو ہمیں اسے اپنے عمل سے ثابت کرنا چاہیے، نہ کہ محض القابات کے ذریعے۔ (باقی ص:46 پر)

موضع ابراہیم پور، ضلع اعظم گڑھ

فکر و نظر

اخلاق نبوی ﷺ اور آج کی مسلم قیادت

بزمِ دانش میں آپ ہر ماہ بدلتے حالات اور ابھرتے مسائل پر فکر و بصیرت سے لبریز نگارشات پڑھ رہے ہیں۔ ہم اربابِ قلم اور علماے اسلام کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ دیے گئے موضوعات پر اپنی گراں قدر اور جامع تحریریں ارسال فرمائیں۔ غیر معیاری اور تاخیر سے موصول ہونے والی تحریروں کی اشاعت سے ہم قبل از وقت معذرت خواہ ہیں۔ از: **مبارک حسین مصباحی**

* نومبر 2025 کا عنوان — حافظِ ملت علیہ الرحمہ کے امتیازات
* دسمبر 2025 کا عنوان — فقہ اسلامی اور دستورِ ہند کا تقابلی جائزہ

سیرت نبوی میں قیادت کے اسرار

از: مفتی توفیق احسن برکاتی، استاذ جامعہ اشرفیہ، مبارک پور

دنیا کے انصاف پسند محققین جب انسانی اخلاقیات کے جواہر تلاش کرتے ہیں تو سیرتِ نبوی کے بحرِ زخار کی تہوں میں وہ اپنا مطلوب پا لیتے ہیں۔ یہاں زندگی کا ایسا انوکھا کمال، بندگی کا ایسا چمک دار رنگ، فکر و نظر کا ایسا ہوش ربا جلوہ، اخلاق و کردار کی ایسی دلکشی اور ربط و ضبط کا ایسا جمال دکھائی دیتا ہے جس کی مثال محال ہے۔ یہاں اخلاقی جمالیات کی ہر جہت روشن و تابندہ ہے۔ وہ ذاتِ گرامی کردار کی پختگی اور سماجی زندگی کی شفافیت کا ایسا نگار خانہ ہے جہاں ہر کمال و جمال اپنے امتیازی آہنگ کے ساتھ موجود ہے۔ مبدءِ فیض نے انھیں "وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ" کا محسوس پیکر بنایا اور اس پیکر کو ایسی نورانی و عرفانی توانائی سے مالا مال کیا کہ بہ قول شاعر: "نظر ٹھہرتی نہیں عارضِ منور پر"۔

آئیے! اس نورانی پیکر میں کچھ ایسے حقائق و شواہد تلاش کرتے ہیں جو منصفانہ اور غیر جانب دارانہ قیادت کی حقیقت کو روشن کر دیتے ہیں۔ ویسے قیادت کی عام شرطوں میں (۱) اخلاص وایثار، (۲) حکمت و تدبر، (۳) یقین و اعتبار، (۴) مقصد سے آگہی، (۵) قوتِ فیصلہ، (۶) اصول پسندی، (۷) شجاعت، (۸) دور بینی اور (۹) مسلسل حرکت و عمل کی نشان کی جاتی ہے لیکن سیرتِ نبوی میں ان اختصاصی خوبیوں کے علاوہ درج ذیل حقائق بھی نشان زد کیے جا سکتے ہیں:

(۱) جامعیت کا کمال (۲) تنوع کا رنگ (۳) شفافیت کا حسن (۴) اعتدال کا جوہر (۵) قانون سازی اور عملی اقدام (۶) شیریں بیانی (۷) مخلص دوستوں پر اعتماد۔ ان امور کا مختصر جائزہ پیش خدمت ہے:

(۱) جامعیت کا کمال:

اگر انسانی تاریخ کا مطالعہ و تجزیہ کیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ جنھیں دنیا انسانی تاریخ کے اکابر و اشراف میں شمار کرتی ہے جب ایسے افراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابل لائے جاتے ہیں تو ان کے آگے بونے نظر آتے ہیں۔ رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی جامعیت کا مرقع تھی اور ان کی تعلیمات انسانی زندگی کے تمام شعبوں کا احاطہ کرتی ہے۔ ایک ایسا انسانِ کامل جو تکمیلیت کا استعارہ بن گیا۔ ایسا فرد فرید جو جامعیت کا نشانِ امتیاز بن گیا۔ انسانی کمالات کی چمک دمک بھی زندگی کے تمام گوشوں کو محیط ہے۔ بلکہ یہاں نظریاتی وعملی، فکری وسیاسی، اخلاقی وروحانی، معاشی وتمدنی اور تہذیبی وثقافتی حسن وجمال کی ہر جہت دکھائی دیتی ہے۔ علم وادب، فلسفہ وحکمت اور اخلاق وقانون کا ایسا ماہر جو سوال سے قبل جواب پیش کردے۔ ذکاوت وفطانت کا ایسا پیکر جمیل اور قیادت وسیادت کا ایسا مدبر دنیا نے دیکھا، نہ سنا۔ اس کی ہدایتیں بین الاقوامی فضا ہموار کرتی ہیں۔ جامعیت کا یہی کمال انھیں آفاقی بناتا ہے۔

(۲) تنوع کا رنگ:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات کے اتنے گوشے ہیں کہ ان کا مکمل احاطہ بہت مشکل ہے۔ یہ وہ تنوع ہے جو ان کی زندگی کو سب سے ممتاز بنا دیتا ہے۔ انسانی زندگی کے مختلف شعبوں میں مصروفِ عمل انسانوں کے لیے ان کی مبارک زندگی بے مثال نمونہ ہے۔ خانگی امور سے لے کر بین الاقوامی معاملات ومسائل تک یہ جامع اور متنوع زندگی دنیا کی رہنمائی کرتی ہے۔ انسانیت کا کمال اور قیادت کا جمال اس زندگی کے دریا میں ایسا عکس چھڑکتا ہے کہ وہی عکس کمالِ انسانیت اور جمالِ قیادت وتدبیر کی مثال بن جاتا ہے۔ تاریخ انسانی کا مطالعہ بتاتا ہے کہ دنیا میں آنے والا ہر انقلاب یا تو سیاسی رہا یا اقتصادی، ثقافتی رہا یا معاشی وسماجی، لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا انقلاب اخلاقی وروحانی بھی تھا، ثقافتی وسیاسی بھی، طبیعاتی واقتصادی بھی تھا اور تعلیمی وتہذیبی۔ یعنی ایسا جامع وہمہ گیر جو انسانی زندگیوں کو ان خوشیوں اور خوش حالیوں سے فیض یاب کر دے جن کا انھیں مدتِ دراز سے انتظار تھا۔ تنوع کا یہ رنگ سیرتِ نبوی کے تمام ابواب میں واضح دکھائی دیتا ہے، جو تدبیر وتدبر کے ایسے سربستہ رازوں سے ہمیں آگاہ کرتا ہے جو قیادت وسیاست کو صراط مستقیم پر لا کھڑا کرتے ہیں۔

(۳) شفافیت کا حسن:

انسانی زندگی میں اگر شفافیت نہ ہو تو وہ کہیں بھی اپنا کوئی اثر نہیں چھوڑتی۔ یعنی انسان کی ظاہری وباطنی زندگی میں کوئی جھول نہ ہو، نہ وہ کسی خارجی طاقت کا دباو محسوس کرے۔ دیانت داری اور انصاف پر مبنی ہر حکم اور ہر فیصلہ اثر انگیز ہوتا ہے اور ہر کوشش نتیجہ خیز ثابت ہوتی ہے۔ سیرت نبوی کا مطالعہ بتاتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام جنگی وسیاسی فیصلے اس قدر شفاف اور واضح رہے کہ انھیں اپنا اثر دکھانا ہی تھا۔ کامیاب لیڈر شپ وہی ہوتی ہے جس کے ہر کارکن کو اپنے قائد کے فرامین پر پورا یقین ہو اور ان کی بجاآوری میں کوئی تردد نہ کیا جائے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اپنے آقا کے ہر حکم پر سر تسلیم خم کرتے تھے اور جان ومال کی ہر قربانی دینے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آقائی بھی کمال کی تھی، جو اپنے ہر صحابی کو اپنا دوست سمجھتا ہو، ان کے دکھ کو اپنا دکھ اور ان کی خوشی کو اپنی خوشی جانتا ہو اس کا سلوک دوستانہ ہی ہوگا، جہاں خود غرضی کا شائبہ تک نہ تھا، ہر ربط وانسلاک بے نفسی اور اخلاص پر مبنی تھا۔ یہی وجہ ہے کہ کم وقت میں انھیں بہت بڑی بڑی فتوحات اور کامیابیاں ملیں کہ دنیا کے ماہر ومشہور جرنیل وسپہ سالار اپنی تمام تر جنگی طاقتوں اور افرادی قوتوں کے باوجود بھی حاصل نہ کر سکے۔

(۴) اعتدال کا جوہر:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر حکم اور ہر فرمان میں اعتدال وتوازن کی ایسی خوبی ملتی ہے کہ افراط وتفریط کا کوئی نشان تلاش ہی نہیں کیا جا سکتا۔ اللہ رب العزت نے انھیں جو شریعت عطا فرمائی اس میں افراط وتفریط کی کوئی گنجائش تھی ہی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے ایسا معتدل نظام حیات تشکیل دیا جو دنیاوی

دولت کی منصفانہ تقسیم کی ضمانت دیتا ہو اور انسانوں کو ایک متوازن طرزِ زندگی جینے کا سلیقہ عطا کرتا ہو۔ بلفظ دیگر یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کی زندگی میں نبوت و حکمرانی کا ایسا حسین امتزاج نظر آتا ہے جو انھیں شاہِ خوباں بنا دیتا ہے۔

(۵) قانون سازی اور عملی اقدام:

فقط قانون بنا دینا اور انسانی سوسائٹی میں اس کے نفاذ کی کوشش کرنا کمال نہیں ہے۔ اگر قانون ساز انسان کی زندگی میں اس کے ذریعہ پیش کردہ قوانین کے نشانات نظر نہ آئیں تو سخت مایوسی ہوتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تشریعی کمال ہمیں کہیں مایوس نہیں کرتا۔ ان کی قانون سازی کی خوبی ناقابل فراموش ہے۔ انسانی معاشرہ آج تک ایسا باکمال قانون ساز اور دور اندیش سیاسی مدبر نہ تلاش کرسکا جس کی زندگی کا ہر شعبہ قانون بھی فراہم کرتا ہو اور اپنی عملی زندگی میں اس کو نافذ کرنے والا بھی دکھائی دیتا ہو۔ شریعت کا ہر قانون ان کی زندگی میں اوروں کے بالمقابل زیادہ شفاف دکھائی دیتا ہے جو انسانی ذہنوں اور فکروں کو انگیز کرتا ہے اور غیر محسوس انداز میں دنیا کو تلقین کرتا ہے۔

ذرا میثاقِ مدینہ پر غور فرمائیں تو اندازہ ہوگا کہ یہ دنیا کا پہلا تحریر دستوری قانون ہے جو ریاست مدینہ کی تشکیل کے وقت نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم نے مدون و مرتب کیا تھا۔ یہ دستور باہمی مشاورت سے منظور کیا گیا۔ جس کے بارے میں محققین لکھتے ہیں کہ میثاقِ مدینہ باون دفعات پر مشتمل دنیا کا پہلا تحریری دستور ہے۔ جو قانونی عبارت اور دستور نویسی کا نادر وانمول نمونہ ہے اور اس کی اہمیت وثقاہت تمام انصاف پسند مورخوں نے تسلیم کی ہے۔ یہ سن دو ہجری میں جاری کیا گیا اور ریاستِ مدینہ کے تمام تر انتظامی و قانونی معاملات و مسائل کا تصفیہ کرتا ہے۔

اسی طرح خطبۂ حجۃ الوداع کو دیکھ لیں، یہ انسانیت کا ایسا منشورِ آزادی ہے جو ہر شخص کے بنیادی حقوق یعنی جان، مال، عزت وآبرو کی ضمانت دیتا ہے اور انھیں معاشی واقتصادی استحصال سے بچاتا ہے۔ انسانوں کے درمیان شرف وبزرگی کا معیار متعیّن کرتا ہے اور انسانی سماج میں ہونے والی غیر انسانی اور ظالمانہ تقسیم کی شکار انسانیت کو مژدۂ جاں فزا سناتا ہے۔

(۶) شیریں بیانی:

کرخت لہجہ کبھی کسی کو متاثر نہیں کرتا، انسانی اخلاقیات میں شیریں بیانی کو نمایاں مقام حاصل ہے۔ بات بات پر غضب ناک ہوجانا، ڈانٹ ڈپٹ کرنا، غیر ضروری تنقیدیں کرنا اور دل کو چھلنی کردینے والے الفاظ اور جملوں کی بارش کرنا کسی کے لیے کبھی سود مند ثابت نہیں ہوا۔ ایک قائد اگر ان ناپسندیدہ عادتوں کا شکار ہوگا تو اس کی قیادت کبھی کامیاب اور اثر پذیر نہ ہوگی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شیریں بیانی کا پورا عرب قائل رہا ہے، جس نے بھی ایک بار ان سے شرفِ لقا پایا ہے وہ جانی دشمن رہتے ہوئے اس حقیقت کے اعتراف پر خود کو مجبور پاتا ہے کہ محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان وبیان اور لہجے وادا میں کسی طرح کی کرختگی کا نام ونشان نہ تھا۔

سخت ترین لہجوں کا شکار انسانی افراد تنگ دل بھی ہوتے ہیں اور خود غرض بھی۔ لیکن یہاں نہ تنگ دلی ہے نہ خود غرضی کا کوئی رنگ اور کرخت لہجہ تو کبھی ان کی زبان سے سنا ہی نہیں گیا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام دشمن یہود ونصاریٰ اور مشرکین وکفار اپنے بچوں اور ماتحتوں کو انھیں ایک نظر دیکھنے، ان کے پاس بیٹھنے اور ان کی بات سننے تک سے منع کرتے تھے۔ کہیں ان کی شیریں بیانی دل میں گھر نہ کرجائے۔ سچ تو یہ ہے کہ شیریں مقال انسان بہت جلد انسانی اذہان وقلوب میں اپنی جگہ بنالیتا ہے اور جو اس سے ایک بار جڑتا ہے تو کبھی الگ نہیں ہوتا۔ ایسے انسان کے مزاج میں عفو ودرگزر شامل ہوتا ہے جو ہر لمحہ اس کی دست گیری کرتا ہے۔

(۷) مخلص دوستوں پر اعتماد اور مشاورت:

کسی بھی لیڈر شپ کی کامیابی کے لیے مخلص اور ایثار پیشہ

دوستوں کا ہونا از حد ضروری ہے۔ انسان تنہا منصوبے بنا سکتا ہے، اپنے مشن کے مقاصد واغراض متعیّن کر سکتا ہے، کوئی خواب بُن سکتا ہے لیکن ان منصوبوں کو زمین پر اتارنے، ان مقاصد واغراض کو حاصل کرنے اور اپنے خوابوں کو شرمندۂ تعبیر کرنے کے لیے اسے باوفا افراد کی ضرورت ناگزیر ہے۔ "لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا" کے مصداق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ رب العزت نے ایسے جاں نثار اصحاب عطا فرمائے جنھوں نے خود کو نبوی مشن سے ایسا جوڑا کہ اب ان کی زندگی کا اس کے سوا کوئی اور مشن تھا ہی نہیں کہ وہ اپنی جان ومال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ناموس کی حفاظت اور ان کی تعلیمات کے فروغ میں صرف کردیں۔

ساتھ ہی حقیقت کا ایک رخ یہ بھی ہے کہ اس عظیم قائد ورہنما نے کسی مشکل وقت میں اپنے دوستوں کو اکیلا نہیں چھوڑا اور ان کی جان ومال اور عزت وایمان کے تحفظ کا مناسب انتظام کرتے رہے اور انھیں کسی کمی کا کوئی احساس نہیں ہوا۔ اپنے اصحاب پر ان کا اعتماد سیرت نبوی کا ایک روشن باب ہے۔ گویا باہمی اعتبار واعتماد کا یہ نسخہ ان حضرات کو ہر میدان میں کامران کرتا رہا اور فروغِ اسلام کی راہ میں کھڑی کی جانے والی ہر رکاوٹ رُوئی کا ڈھیر ثابت ہوتی رہی۔ کئی بار ایسا ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف مواقع پر اور بطورِ خاص محاذِ جنگ پر جانے سے پہلے مجلسِ مشاورت منعقد فرمائی اور کھل کر صحابہ کو اپنی رائے دینے کا اختیار دیا تاکہ ان کا اعتماد بحال رہے اور نفسیاتی طور پر انھیں خوشی مل سکے۔

یہ چند نشان زد اُمور سیرتِ نبوی کے مختلف ابواب کے مطالعے سے ماخوذ ہیں۔ ان کی روشنی میں ہر دور کی مسلم قیادت اپنا قبلہ درست کر سکتی ہے۔ تاریخ اسلام کا مطالعہ کرنے والا جانتا ہے کہ جب تک ہمارے مسلم حکمرانوں اور قائدین میں یہ خوبیاں پائی جاتی رہیں دنیا کی کوئی طاقت انھیں زیر نہ کر سکی اور اسلام دشمن طاقتوں کی ہر سازش ناکام ہوتی رہی اور امت مسلمہ ہر محاذ پر فاتح رہی۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلم قیادت اپنے ذاتی اغراض واہداف کو چھوڑ کر پوری مسلم دنیا کی تعمیر وترقی کا چارٹر تیار کرے اور مخلص ہو کر اپنے فرائض منصبی کی ادائیگی کی کوشش کرے تو آج بھی ہماری عظمت رفتہ بحال ہو سکتی ہے اور عروج وارتقا کو وہ مقام دوبارہ حاصل کیا جاسکتا ہے جو ماضی میں ہماری شناخت رہا ہے۔ [محررہ: ۱۷/ اگست ۲۰۲۵ء]۔

□□□

قیادت کے لیے نسخۂ کیمیا

از: مفتی محمد اعظم مصباحی مبارک پوری، استاذ جامعہ اشرفیہ، مبارک پور

مصطفیٰ جانِ رحمت ﷺ کی سیرت دنیاے انسانیت کے لیے آئیڈیل اور نمونہ ہے۔ حضور کا اسوہ آفاقی ہے، حضور کی سیرت اور اسوہ میں انسانیت کی فلاح وظفر مضمر ہے۔ ایک بہترین معاشرہ کی تشکیل میں اگر حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی سیرت کا تقلیدی عنصر شامل نہ ہو تو کبھی بھی معاشرہ ترقی کی راہ پر گامزن نہیں ہو سکتا۔ حضور کی سیرت صرف امت مسلمہ کے افراد ہی کے لیے نمونۂ عمل نہیں ہے بلکہ دنیا کے ہر چھوٹے بڑے امیر وفقیر، بادشاہ ورعایا، حاکم ومحکوم اور ہر برادری اور سماج کے لیے بہترین اسوہ ہے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ۔

تمھارے لیے رسول کی سیرت میں بہترین نمونہ ہے۔

حضور کی سیرت کے بہت سارے گوشوں میں سے ایک گوشہ حسنِ خُلق کا ہے، ہمارے حضور اخلاقِ حسنہ کے بلند مرتبہ پر فائز تھے، حضور کی اس خوبی کو بیان کرتے ہوئے قرآن ناطق ہے:

"وَ اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ"۔

اخلاقِ حسنہ کو انسانی زندگی میں جو مقام و مرتبہ حاصل ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ اخلاق ایک وسیع مفہوم لیے ہوئے ہے۔ اخلاق، عفو و درگزر، حلم و بردباری، صبر و تحمل، خندہ پیشانی سے پیش آنا، صلح و آشتی، محبت و شفقت، رفق و نرمی، اتحاد و اتفاق وغیرہ اور نفرت و عداوت، اختلاف و انتشار، زجر و توبیخ وغیرہ سے کنارہ کش رہنے سے تعبیر ہے۔ حضور سیدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کا مطالعہ کرنے والا بخوبی واقف ہے کہ سرکار کی حیات طیبہ میں ایسے بے شمار واقعات ملیں گے کہ آپ نے چھوٹوں پر شفقت، بڑوں سے محبت کا عملی درس کس احسن انداز میں پیش فرمایا۔ نفرت و عداوت اور اختلاف و انتشار سے دور رہ کر باہمی اتحاد و اتفاق اور صلح و آشتی کا پیغام عام کیا۔ آپ نے اپنے جانی دشمنوں کو صرف معاف ہی نہیں فرمایا بلکہ ان کے سامنے محبتوں کا ایسا اظہار فرمایا کہ دشمن آپ کے گرویدہ ہو گئے۔

حضور کے ان اخلاقی اقدار پر ہر فرد کو عمل پیرا ہونے کی ضرورت ہے اور جنھیں کسی بھی جہت سے امامت و قیادت کا کام سرانجام دینا ہے انھیں اخلاق حسنہ کی صفات پر کاربند ہونا بدرجۂ اولیٰ ضروری ہے۔ بڑے لوگوں کا المیہ یہ ہے کہ امت نے ان کو قیادت کا منصب اگر تفویض کیا ہے تو پھر ان کے اندر اخلاقی گراوٹ آگئی ہے، ان کے پاس لوگوں کے مسائل سننے کے لیے وقت کم ہے۔ عوام کی پریشانیوں کا حل تلاش کرنے میں کوتاہی سے کام لیتے ہیں۔ اگر ان کے سامنے کوئی کم ظرفی کا مظاہرہ کرتا ہے تو وہ صبر و تحمل کو بروے کار لانے کی بجاے سختی سے پیش آتے ہیں، کبھی ان کے مرتبہ اور مقام کے مطابق کوئی بات سرزد ہو گئی تو برس پڑتے ہیں۔ کبھی مسلمانوں کے کے درمیان نا مساعد حالات پیدا ہو گئے تو وہ اپنی عزت و ناموس کو ترجیح دیتے ہیں، مسلمانوں کے لیے قومی ہمدری ان کے اندر بیدار نہیں ہوتی ہے۔

ہم حضور کی امت ہیں، حضور کی بعثت کا ایک نمایاں مقصد یہ بھی تھا کہ (ترجمہ: میری بعثت اخلاق حسنہ کی تکمیل کے لیے ہوئی ہے) لہٰذا ہم اور ہمارے قائدین اخلاق بعثتِ نبوی کے مقاصد کو سمجھتے ہوئے اپنی عملی زندگی میں اخلاقی پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی کوشش کریں، ذیل کی سطور میں حضور صلی اللہ تعالی علیہ وسلم کے اخلاق کریمانہ کی روشنی میں بعض مثالیں ذکر کرنے کی سعادت حاصل کرتے ہیں تاکہ امت کا عام فرد اور قیادت وامامت کا فریضہ انجام دینے والا شخص ان کی روشنی میں اپنی زندگی میں انقلاب پیدا کر کے کامیابی کی راہ پر گامزن ہو سکے۔

حضور سید عالم صلی اللہ تعالی علیہ وسلم قائد المرسلین ہیں اور دنیا میں سب سے بڑھ کر عقل و دانش کے مالک ہیں، حضور کی رائے سب سے درست اور حضور کا مشورہ سب سے بلند اور قابل عمل ہوتا تھا اس کے باوجود حضور سرور عالم صلی اللہ تعالی علیہ وسلم قرآنی ہدایات پر پورے طور سے عامل تھے کبھی بھی کوئی معاملہ درپیش ہوتا تو اپنے صحابہ سے مشورہ کرتے، ان کے مشوروں کا احترام فرماتے۔ سیرتِ طیبہ میں اس کی بہت ساری مثالیں آپ کو دیکھنے کو مل جائیں گی۔ غزوہ بدر کے قیدیوں کے سلسلے میں سرکار نے صحابہ سے مشورہ فرمایا، اسی طرح غزوہ خندق کے موقع پر جب قریش نے اپنے اتحادیوں کے ساتھ مدینہ طیبہ پر چڑھائی کرنے کا ناپاک منصوبہ بنایا تو حضور نے صحابہ سے مشورہ فرمایا۔ حضرت سلمان کے مشورے پر خندق کھودی گئی اور اس کے مطابق صحابہ کو عمل درآمد کرنے کا حکم دیا۔ اس طرح اور بھی بہت ساری مثالیں احادیث طیبہ میں موجود ہیں جو ہمارے ملی قائدین کے لیے درس عمل ہیں کہ حضور کی امت میں جس شخص کو بھی یہ منصب ملا وہ بھی اپنے لوگوں سے مشورہ کرے اور مشورے کے بغیر کوئی اقدام نہ کرے۔ اگر ان کی رایوں میں

اختلاف ہوجائے تو حکمت عملی کے ساتھ اکثریت کے مشورے پر لوگوں کو عمل کے لیے آمادہ کرے۔

احترام انسانیت بھی حضور کے اخلاق کریمانہ کا ایک اہم حصہ ہے ۔ حضور سید عالم صلی اللہ تعالی علیہ سلم لوگوں کے معاملات سنتے ان کی عزت و ناموس کا خیال فرماتے، کسی کی بے جا تذلیل کو ہرگز پسند نہ فرماتے ۔ چھوٹے بڑوں کی باتیں بڑی متانت کے ساتھ سماعت فرماتے ۔ آپ نے خدمت خلق کا بہترین درس امت کو عطا فرمایا۔ ملی قائدین کے لیے یہ رہنما اصول بیان فرما کہ "قوم کا سردار قوم کا خدمت گار ہے "لہذا قائدین کے اندر قوم وملت کی خدمت کا جذبہ صادق موجود ہونا ضروری ہے۔

حکمت و دانائی بھی عظیم اخلاقی صفت ہے۔ حضور صلی اللہ تعالی علیہ وسلم بڑے سے بڑے معاملات اپنی حکمت وتدبر سے سلجھاتے ۔ آپ کی حکمت عملی سے عربی قبائلی کے آپسی تعصبات کا خاتمہ ہوا اور ان کے درمیان اخوت و بھائی چارہ کا ماحول قائم ہوا۔ آپ کی حکمت نے عربی معاشرہ کو ایک مہذب اور متحد معاشرے کے قالب میں ڈھالا گیا حضور نے ہمیشہ عدل و انصاف کے ساتھ فیصلے صادر فرمائے، حجر اسود کی تنصیب کا انتہائی حساس معاملہ آپ کی حکمت علمی اور تدبیر سے طے ہوا، ان تمام باتوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہمارے نبی شروع سے ہی اخلاق حسنہ کی تمام تر خوبیوں کے جامع تھے۔

حضور نے اپنی احادیث میں حکمت و دانائی کے زیور سے آراستہ ہونے کی امت کو تعلیم عطا فرمائی، قرآن کریم نے آپ کی بعثت کے مقاصد سے ایک مقصد "کتاب و حکمت کی تعلیم" بیان فرمایا۔ ایک حدیث میں حضور نے حکمت کو مومنین کا اثاثہ قرار دیا۔ امتِ مسلمہ کے قائدین کے لیے یہ ایک نسخۂ کیمیا ہے، ہر قائد کو چاہیے کہ خود کو ان خوبیوں سے آراستہ کرنے کی کوشش کرے تاکہ مسلم امہ کی بحسن وخوبی قیادت کرسکے۔

■■■■■

(ص:40 کا بقیہ)

ایک بہترین معلم، معلمہ، فقہی، فقیہہ یا قاری، قاریہ وہ ہوتے ہیں۔ جس کے عمل سے اس کے علم کی گواہی ملے، نہ کہ صرف اس کے نام کے ساتھ لکھے گئے کسی لقب سے۔

بے شک، بعض مواقع ایسے ہوتے ہیں جہاں اپنے علمی مقام کو ظاہر کرنا ضروری ہو، جیسے کسی تحقیقی مقالے، فتویٰ، یا علمی مجلس میں۔ لیکن عام طور پر، القابات کو حد سے زیادہ نمایاں کرنا بعض اوقات علم کی حقیقی روح کو پسِ پشت ڈال دیتا ہے اور محض دکھاوے کا سبب بن جاتا ہے۔ اس لیے دکھاوے سے بچتے ہوئے سنجیدگی سے دینی کام پر توجہ دیں نہ کہ القابات کی دنیا میں مگن ہوکر حقیقی علم سے بے خبر۔ اور اپنے امام کا شعر ہمیشہ اپنی نگاہ کے سامنے رکھیں؛

بے نشانوں کا نشان مٹتا نہیں
مٹتے مٹتے نام ہو ہی جائے گا

علم ایک امانت ہے، اور اس کی نسبت وہی لوگ اپنے نام کے ساتھ کرسکتے ہیں جو اس کے صحیح حق دار ہوں۔ جو لوگ القابات کو اپنی علمی حیثیت کے اظہار کے لیے استعمال کرتے ہیں، وہ بھی درست عمل کر رہے ہیں، لیکن میں ذاتی طور پر اس بات کو زیادہ پسند کرتی ہوں کہ علم کا اظہار عمل اور مہارت کے ذریعے ہو۔ میرے نزدیک، کسی بھی لقب کو اختیار کرنے سے زیادہ ضروری یہ ہے کہ ہم اپنی علمی ذمہ داریوں کو احسن طریقے سے نبھائیں، تاکہ معاشرہ ہمارے علم سے حقیقی طور پر مستفید ہو سکے، اور ہمیں اپنی علمی حیثیت ثابت کرنے کے لیے کسی اضافی اعلان کی ضرورت نہ پڑے۔ کیوں کہ علم کو ظاہر کرنے کے بجائے اس عمل میں لانا ہی اصل کامیابی ہے۔

اللہ رب العزت ہم سب کو اس علم کو مکمل ذمہ داری امانت داری سے دوسروں تک پہنچانے والے بندوں میں شامل کرے۔

■■■■■

گوشۂ ادب

الذکر المختصر فی القطب المزدھر

حضور قطب المدار علیہ الرحمہ کے احوال وآثار کا گراں قدر دستاویزی مجموعہ

مولانا طفیل احمد مصباحی

سوانح نگاری کا شمار "غیر افسانوی ادب" میں ہوتا ہے۔ سوانح، سانحہ کی جمع ہے۔

ظاہر ہونے والی چیز اور پیش آنے والے واقعہ و حادثہ کو "سانحہ" کہتے ہیں۔ لیکن جب "سوانح" کے ساتھ "عمری" کا لاحقہ ہو تو اس وقت یہ ترکیب کسی بھی عظیم شخصیت کی حیات و خدمات اور اس کی حالاتِ زندگی کے مفہوم پر دلالت کرتی ہے۔ داستان، افسانہ، ڈرامہ، اور ناول جیسی تمام اصناف کو "افسانوی ادب" کا درجہ حاصل ہے۔ جب کہ مضمون، مقالہ، سوانح، سیرت وتذکرہ، خاکہ، سفر نامہ، خود نوشت سوانح، طنز و مزاح، مکتوب، انشائیہ اور رپورتاژ جیسی اصناف "غیر افسانوی ادب" کے زمرے میں آتی ہیں۔ فورٹ ولیم کالج، کلکتہ اور فورٹ سینٹ چارج کالج مدراس کے توسط سے "افسانوی ادب" کا فروغ ہوا اور اردو ادب پر داستانوں کی حکمرانی رہی۔ لیکن 1824ء میں دہلی کالج کے قیام کے بعد "غیر افسانوی ادب" کی طرف توجہ دی گئی، جس سے مضمون نویسی اور سوانح نگاری کے فن کا آغاز ہوا۔ علی گڑھ تحریک سے غیر افسانوی ادب کو کافی فروغ ملا، جس میں تذکرہ نویسی و سوانح نگاری خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہے۔ سوانح نگاری کو "تذکرہ نویسی" بھی کہتے ہیں۔ راقم الحروف کی محدود معلومات کے مطابق تذکرہ میں ایجاز و اختصار ہوتا ہے، جب کہ سوانح میں تفصیل ہوتی ہے۔ ولادت سے لے کر وفات تک کے احوالِ زندگی کو مدلل و مفصل انداز میں بیان کرنے کو "سوانح نگاری" کہتے ہیں۔ ڈاکٹر نسیم الدین فریس کے بقول:

سوانح عمری سے مراد ہے عمر (عہد) نسل اور ماحول پر اثر ڈالنے والے عوامل کے حوالے سے کسی شخص کی داخلی اور خارجی زندگی کے تمام پہلوؤں کا ایسا جامع، مفصل اور معروضی مطالعہ جو اس کی زندگی کے ارتقا اور اس کے ظاہر و باطن کو روشنی میں لاکر اس کی ایک قد آدم اور جیتی جاگتی تصویر پیش کرے۔ سوانح ایک ایسی دستاویز ہے جس میں کسی انسان کی ولادت سے لے کر وفات تک کے تمام حالات و واقعات، افکار و افعال زمان و مکان کی صراحت کے ساتھ موجود ہوتے ہیں۔ سوانح کے کینوس پر زمان و مکان کے تناظر میں کسی انسان کی چلتی پھرتی متحرک تصویر اس طرح سرگرم فکر اور مصروفِ عمل نظر آتی ہے کہ اس کی سیرت و شخصیت اور سرگزشت کے تمام پہلو ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔

اپنے دعوتی مشن اور تبلیغی مساعی سے ارضِ ہند کو لالہ زار بنانے والی عظیم المرتبت شخصیات میں شیخ المشائخ، قطب الاقطاب، قدوۃ الاولیاء حضور سید شاہ بدیع الدین قطب المدار علیہ الرحمہ (متوفیٰ:۸۳۸ھ) کا نام بھی سرِ فہرست ہے، جو عرفِ عام میں "زندہ شاہ مدار" کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ آپ کا شمار برِّ صغیر پاک و ہند کے جلیل القدر اولیا، عظیم المرتبت صوفیا اور مایۂ ناز مشائخ میں ہوتا ہے۔ آپ عبادت وریاضت، مجاہدہ و مکاشفہ اور کشف و کرامات میں بے مثال اور یگانۂ روزگار تھے۔ آپ کی ذات سے دینِ اسلام کا بے پناہ فروغ اور صوفیانہ مسلک و مشرب کی توسیع و اشاعت ہوئی۔ آپ نہایت عابد و زاہد، صابر و شاکر، متواضع اور قانع بزرگ تھے۔ اپنی نگاہِ کیمیا اثر سے ہزاروں اشخاص کے قلوب کو منور و مجلیٰ فرمایا۔ انگنت افراد کو زمین کی پستیوں سے اٹھا کر آسمان کی بلندیوں پر پہنچا دیا

سابق سب ایڈیٹر، ماہ نامہ اشرفیہ

اور بیشمار بھٹکے ہوئے بندگانِ خدا کو صراطِ مستقیم پر گامزن فرمایا۔ آپ کی پوری زندگی دعوت و تبلیغ، رشد و ہدایت، وعظ و ارشاد اور خدمتِ خلق میں بسر ہوئی۔ اگرچہ آپ کو شہرت "قطب المدار" سے ملی (جو کہ ولایت کا ایک اعلیٰ مقام ہے)، لیکن آپ کا مقام و مرتبہ اس سے بھی کہیں اعلیٰ و ارفع ہے۔ اللہ رب العزت نے آپ کو بلند مقامات اور اعلیٰ مدارج سے سرفراز فرمایا تھا۔ آپ صاحبِ مقاماتِ کبریٰ تھے۔ غوث العالم، محبوبِ یزدانی حضرت مخدوم اشرف جہانگیر سمنانی علیہ الرحمہ کے علاوہ سیکڑوں صوفیا و مشائخ اور علما و مصنفین نے آپ کے علمی تبحر، مقاماتِ عالیہ اور آپ کی بلند و بالا روحانی و عرفانی شخصیت کا تذکرہ بڑے والہانہ انداز میں کیا ہے۔ مرزا لعل بیگ بدخشی نے اپنی مایۂ ناز تصنیف "ثمرات القدس من شجرات الأُنس" میں آپ کا تعارف ان الفاظ میں پیش کیا ہے، جس سے آپ کی شانِ ولایت اور مرتبۂ روحانیت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے:

سید بدیع الدین قطب الادوار لقب بہ "شاہ مدار" قدس سرہ، از کبرائے مشائخ ہند و عظمائے عرفائے آں دیار ست، بسیار عالی قدر و صاحبِ کراماتِ ظاہرہ و عاداتِ فاخرہ بود و مقامات علیّہ و کمالات جلیّہ و مواہبِ جزیلہ و احوالِ سنیّہ داشت۔ (ثمرات القدس من شجرات الانس، ص:41، مطبوعہ: پژوہشگاہ علوم انسانی و مطالعاتِ فرنگی، تہران)

علمی و تحقیقی سفر ایک مسلسل جد و جہد کا نام ہے، جس میں تغافل و تکاسل کی کوئی جگہ نہیں۔ بیدار مغزی، علوئے ہمتی اور جانفشانی کے بغیر یہ سفر منزل آشنا ہو سکتا ہے اور نہ اپنے اہداف تک رسائل حاصل کر سکتا ہے۔ ایک محقق اپنے خونِ جگر سے علم و تحقیق کا چراغ روشن کرتا ہے، جس سے زمانہ صدیوں تک روشنی حاصل کرتا ہے۔ محققِ عصر، فاضلِ گرامی حضرت علامہ مفتی ہاشم علی بدیعی مصباحی دام ظلہ العالی نے "الذکر المختصر فی القطب المزدھر" کی شکل میں علم و تحقیق کا جو چراغ جلایا ہے، اس کی روشنی بزمِ علم و تحقیق کو منور اور نئی نسل کو فیضیاب کرتی رہے گی۔ تذکرہ و سوانح کی کتابیں آئے دن منظرِ عام پر آتی رہتی ہیں، لیکن زیرِ نظر کتاب میں جو علم و تحقیق کا رنگ ہے، وہ قابلِ قدر اور لائقِ ستائش ہے۔ موصوف نے درجنوں کرم خوردہ مخطوطات اور نادر و نایاب کتب و رسائل کی مدد سے عربی زبان میں ایک ایسا بلند پایہ مجموعہ تیار کیا ہے جسے ہم "کرامتِ زندہ شاہ مدار" ہی کہہ سکتے ہیں۔ اس کے سطر سطر سے مصنف کی دقتِ نظری، تحقیقی شعور اور تصنیفی ہنر مندی کا اندازہ ہوتا ہے۔ مولانا موصوف سے راقم الحروف کا علمی رابطہ گذشتہ چند سالوں سے ہے۔ تحقیق و تفحص ان کی فطرت میں شامل ہے۔ تذکرہ و سوانح اور تصوف و صوفیا ان کا خاص میدان ہے۔ "سلسلہ عالیہ مداریہ اور اس کے متعلقات و مخطوطات" پر ایسی گہری نظر رکھتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ جب بھی کسی علمی موضوع پر ان سے گفتگو ہوتی ہے، معلومات میں اضافہ کیے بغیر نہیں رہتے۔ غوث العالم حضرت مخدوم اشرف جہانگیر سمنانی قدس سرہ پر جس وقت راقم الحروف کام کر رہا تھا، آپ نے درجنوں ماخذ کی نشان دہی کر کے میری علمی مدد اور علمی رہنمائی فرمائی تھی۔ 264/ صفحات پر مشتمل اس کتاب (الذکر المختصر فی القطب المزدھر) میں موضوع سے متعلق وہ ساری قیمتی مواد موجود ہے جو علم و تحقیق کے متوالوں کو درکار ہوتی ہے۔ اس سے قبل آپ اردو زبان میں "تذکرہ مشائخِ مداریہ" لکھ کر اہلِ علم سے خراجِ تحسین وصول کر چکے ہیں۔ حضور شاہ بدیع الدین قطب المدار علیہ الرحمہ کی حیات و خدمات اور احوال و آثار پر عربی زبان میں آپ کی یہ دوسری بلند پایہ کتاب ہے جو صوری و معنوی لحاظ سے قابلِ قدر ہے۔

60 صفحات کو محیط ابتدائی کلمات کے علاوہ کتاب دو باب پر مشتمل ہے۔ بابِ اول میں تین فصلیں ہیں۔ فصلِ اول میں حضور قطب المدار علیہ الرحمہ کی ولادت، نام و نسب، اسماء و القاب، تحصیلِ علوم، بیعت و خلافت، سفرِ ہند اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کا حضور زندہ شاہ مدار کے ظہور کی خبر سے متعلق ہے۔ اس فصل کی آخری بحث بڑی دلچسپ ہے۔ بابِ اول کی فصلِ ثانی میں حضور قطب المدار علیہ الرحمہ کی منازلِ عالیہ، مقاماتِ کبریٰ اور آپ کی

شخصیتِ عظمیٰ پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ آپ کو "نسبتِ اویسیہ" حاصل تھی اور آپ مقامِ محبوبیت و مرتبۂ صمدیت پر فائز تھے۔ نیز اس فصل میں سلسلہ عالیہ مداریہ کے امتیازات و خصوصیات پر دلائل و شواہد کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے۔ نیز اس میں سلسلہ مداریہ بصریہ، سلسلہ مداریہ شامیہ، سلسلہ مداریہ جعفریہ اور سلسلہ مداریہ طیفوریہ کی سندات و شجرات کا بھی بیان ہے۔ بابِ اول کی دوسری فصل میں "مقامِ صمدیت" کے حوالے سے مصنف نے بڑی طویل علمی بحث کی ہے اور دلائل و شواہد کے تناظر میں بڑے محققانہ انداز سے حضور قطب المدار علیہ الرحمہ کے مقامِ صمدیت کو ثابت کیا ہے۔ "مقامِ صمدیت" ولایت کا ایک اعلیٰ مقام اور بلند ترین درجہ ہے، جس پر متمکن ہونے کے بعد سالک کی بھوک پیاس ختم ہوجاتی ہے اور اس حالت میں اس کے لباس خستہ و بوسیدہ نہیں ہوتے۔ شیخ عبدالباسط قنوجی اپنے رسالے میں لکھتے ہیں کہ حضور سیدنا قطب المدار علیہ الرحمہ "مقامِ صمدیت" پر متمکن تھے۔ آپ کو قربتِ الٰہی سے لذت آشنا ہونے کے سبب کھانے پینے کی حاجت باقی نہیں تھی۔ آپ پر نیند کا غلبہ نہیں ہوتا تھا۔ آپ کا لباس خستہ اور پرانا نہیں ہوتا تھا اور نہ آپ کے جسم پر مکھی بیٹھتی تھی۔ آپ کے رخِ انور پر انوارِ جھلملاتے تھے۔ ناظرین آپ کے رخِ روشن پر جمالِ خداوندی کا مشاہدہ کیا کرتے تھے۔ فاضل مصنف "مقامِ صمدیت" کا تعارف پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

المكانة الصمدية : هذه عبارة عن الجوع و الصوم من الأكل و الشرب ؛ كما قال الشيخ الخواجه محمد پارسا – رحمه الله تعالى – في كتابه " تحفة السالكين ":مقام جوع رامقام صمدیت گویند، و هو مقام عال له أسرار و تجليات .

یعنی صمدیت بھوکا رہنے اور روزے کی طرح کھانے پینے سے باز رہنے کا نام ہے۔ جیسا کہ خواجہ محمد پارسا قدس سرہ اپنی کتاب "تحفۃ السالکین" میں تحریر فرماتے ہیں کہ "مقامِ جوع (بھوکا پیاسا رہنے کو) کو صمدیت کہتے ہیں۔ یہ ولایت کا ایک اعلیٰ درجہ ہے جس میں سالک اسرارِ الٰہی و تجلیاتِ ربانی سے سرفراز ہوتے ہیں۔ (الذکر المختصر فی القطب المزدھر، ص:87)

علاوہ ازیں شیخ وجیہ اشرف لکھنوی کی "بحرِ زخّار" کے حوالے سے مصنف رقم طراز ہیں:

حضرت قطب المدار را مقامِ صمدیت میسر شدہ بود و آں مقام را چند علامت است (۱) ہر گاہ صوفی آں مقام می رسید باکل و شرب دنیا احتجاج نہ باشد (۲) و ضعف و پیری نمی نماید (۳) و لباس او کہنہ و گریستن نمی شود، ہر کہ جمال باکمال او می بیند، بے اختیار سجدہ می کند، ایں ہمہ علامت در آں حضرت موجود بود.

ترجمہ: حضرت قطب المدار علیہ الرحمہ کو مقامِ صمدیت حاصل تھا۔ مقامِ صمدیت کی چند علامتیں ہیں: (۱) جس وقت صوفی و سالک اس مقام پر پہنچتا ہے، اس کو بھوک اور پیاس کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ (۲) بھوکے پیاسے رہنے کے سبب اس کو ضعف اور کمزوری محسوس نہیں ہوتی۔ (۳) اس کا لباس خستہ اور پرانا نہیں ہوتا۔ نیز جو شخص اس کے جمالِ باکمال کو دیکھتا ہے، بے اختیار سجدے میں گر پڑتا ہے اور مقامِ صمدیت کی یہ ساری علامتیں حضرت شیخ قطب المدار علیہ الرحمہ میں پائی جاتی تھیں۔

(الذکر المختصر فی القطب المزدھر، ص:90)

تیسری فصل میں ارضِ ہند میں آپ کے قدومِ میمنت لزوم کے ذکرِ جمیل، مکن پور شریف میں قیام، رحلت و تدفین، علمی آثار اور اقوال و ملفوظات کے علاوہ آپ کی بے پناہ دعوتی خدمات اور آپ کی تبلیغی مساعی سے رونما ہونے والے خوش گوار اثرات و ثمرات کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔ چنانچہ فاضل مصنف لکھتے ہیں:

يثير عاطفة الإعجاب فى المرء أن مآثر تبليغه قد انبسطت في ضواحي الهند المتحدة من باكستان، و بنجلاديش، وسريلانكا و ميانمار و الهند الموجودة الآن ، حتى أصبحت الجبال والبلاد و القصبات و البراري تحمل اسم

السيد أحمد بديع الدين مدار – قدس سره – مثلا: الجبل المداري، القرية المدارية، المنطقة المدارية ، التكايا المدارية ، الأودية المدارية، المحطة المدارية، و إلى غيرها، إن هؤلاء الأسماء كلها تدل على إسهاماته الهائلة و حياته القيمة بمناسبة الإسلام ، و لذا اتفق المؤرخون قديما وحديثا على أنه من أقطاب الزمان و أكابره، لا يتمكن من غض البصر عن خدماته الجليلة في الهند قاطبة .(الذکر المختصر فی القطب المزدھر،ص:97)

کہاجاتا ہے کہ "كثرة الاسماء تدل على شرف المسمیٰ "یعنی نام کی کثرت مسمی کی فضیلت وبزرگی پر دلالت کرتی ہے۔ حضور زندہ شاہ مدار علیہ الرحمہ ان مایۂ ناز بزرگوں میں سے ایک ہیں، جن کے اسماو القاب کثیر ہیں۔ قطب المدار، شاہ مدار، زندہ شاہ مدار، مدار العالمین، زندہ ولی، مدار الوریٰ اور مدارِ اعظم آپ کے القاب میں سے ہیں۔ سید احمد حلبی، بدیع الدین، شاہ بدیع الدین مدار آپ کے مختلف نام ہیں، جن میں سب سے مشہور نام بدیع الدین مدار ہے اور اہلِ ہند و سندھ آپ کو اسی نام سے موسوم کرتے ہیں۔ اس حوالے سے فاضل مصنف لکھتے ہیں:

و قد ذاع صيته – قدس سره – بأسماء و ألقاب عديدة ، أطلقها عليه محبوه و خلفاءه لما رأوا فيه من مجامع الخير و مكارم الخصال ، فمن أبرز ألقابها: قطب المدار، شاه مدار، زنده مدار، زنده شاه مدار، زنده ولی ، زندان الصوف ، داتا مدار ، بديع الدين ، مدار العالمين ، مدار عالم ، مدار الوریٰ ، مدار أعظم و غيرها، و أما الأسماء التي اشتهر بها فمنها : السيد أحمد الحلبي، بديع الدين، شاه بديع الدين مدار و المشهور من هذه الأسماء اسم "بديع الدين مدار " في شبه القارة الهندية ، حتى أن أهل الهند لا يذكرونه إلا بهذا الاسم . (الذکر المختصر فی القطب المزدھر،ص:67)

بابِ دوم ان اعلام ومشاہیر کے تذکارِ جمیل پر مشتمل ہے، جنہوں نے "سلسلۂ مداریہ" سے اکتسابِ فیض کیا، سرکار سیدنا قطب المدار علیہ الرحمہ کے مبارک ہاتھوں پر بیعت کی اور آپ کے خلیفہ وماذون بنے۔ اس میں کُل تین فصلیں ہیں اور ہر فصل گراں قدر ابحاث اور مفید معلومات پر مشتمل ہے، جو عوام وخواص اور اساتذہ وطلبہ سب کے لیے یکساں مفید ہے۔ علمِ تصوف کے شائقین کو اس کتاب کا ایک بار ضرور مطالعہ کرنا چاہیے۔ بابِ دوم کی پہلی فصل میں آپ کے خلفا اور روحانی تلامذہ کا تذکرہ ہے۔ اہلِ علم سے یہ بات مخفی نہیں کہ حضور سیدنا قطب المدار علیہ الرحمہ نے طویل عمر پائی اور دنیا کے چپے چپے کی سیر فرمائی۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے خلفا و تلامذہ اور مریدین ومسترشدین کی تعداد بیشمار ہے۔ حضرت سید سالار مسعود غازی، حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت اور حضرت مخدوم اشرف جہانگیر سمنانی قدس سرہم جیسی نابغۂ روزگار ہستیوں کو آپ سے سلسلہ مداریہ میں خلافت حاصل ہے۔ آپ کے خلفا کی تفصیل رقم کرنے کے لیے ایک دفتر درکار ہے۔ چنانچہ فاضل مصنف لکھتے ہیں:

لا ينازع فيه كبشان أن خلفاء السيد أحمد بديع الدين قطب المدار – رضي الله عنه – أكثر من أن يحصره كاتب، لابد لذكرهم التام من موسوعة ضخمة، فنقتصر على الترجمة بهؤلاء النابهين منهم ، فإن الإحاطة منهم و الكشف عن مناجي حياتهم، لا يتسع لها صدر هذا المختصر و إذا أردت استقصاء هذا الموضوع ، فارجع إلى تذكرة المتقين، وأخبار الأصفياء وثمرات القدس وظهير الأبرار وتحفة الأبرار والبحر الزخار وغيرهم من دفاتر الكتب ؛ فقد ألم مؤلفوها بحصرهم إلماما ينفع الغلة و يغني عن المزيد و هنا نكتفي بسرد بعض أسمائهم . ■

(جاری)

نقد و نظر

مناقب اہل بیت اطہار اور امام احمد رضا

تبصرہ نگار: مفتی محمد اعظم مصباحی

اہل بیت رسالت کی شان بہت بلند و بالا ہے۔ ان کی طہارت و پاکیزگی کی گواہی قرآن نے دی ہے، ان سے محبت کا درس یہ آسمانی حکم ہے۔ ان کی محبت ہمارے ایمان کا حصہ ہے۔ اہل بیت سے محبت کرنے والوں کے لیے احادیث رسول میں مژدۂ جاں فزا آیا ہے۔ صدر الافاضل سید نعیم الدین مراد آبادی علیہ الرحمہ نے لکھا ہے کہ اہل بہت سے محبت ہمارے لیے فرض ہے۔ اہل بیت کے مناقب قرآن واحادیث میں وارد ہوئے، ان کی عظمت و رفعت اور فضائل و مناقب پر بہت ساری کتابیں لکھی گئیں اور لکھی جاتی رہیں گی۔ علماے اسلام نے تحریر، تقریر، نظم و نثر کی صورت میں ان نفوسِ قدسیہ کی بارگاہ میں اپنی محبتوں کا خراج پیش کیا ہے۔ اعلیٰ حضرت مجدد اعظم امام احمد رضا قدس سرہ العزیزے اپنے فتاویٰ، تصنیفات اور اشعار کی صورت میں اہل بیت اطہار سے محبت و مودت کا درس دیا، ان کے فضائل و مناقب اپنی کتابوں میں درج فرمائے، امام احمد رضا قدس سرہ نے وہابی، قادیانی، دیوبندی، نیچری کے رد کے ساتھ ساتھ نواصب و خوارج اور روافض کا بھی خوب رد فرمایا ہے اور سرکار کے اصحاب کرام اور آل اطہار کی بارگاہوں میں گلہاے عقیدت پیش فرمائے ہیں۔

مولانا مفتی محمد منظر مصطفیٰ ناز صدیقی اشرفی نے امام احمد رضا قدس سرہ کی تصانیف، فتاویٰ، نعتیہ دیوان، اور سیرت سے اس موضوع کے متعلق اعلیٰ حضرت کی بعض تحریروں کو الگ سے کتابی شکل میں یکجا کرنے کی سعادت حاصل کی ہے۔ کتاب کا نام ہے "مناقب اہل بیت اطہار اور امام احمد رضا"۔

مولانا نے کتاب کے شروع میں جو احوال واقعی لکھا ہے اس سے پتا چلتا ہے کہ یہ ان کی نویں تحریر ہے۔ موصوف کا تعلق اندور سے ہے۔ اندور کے مرکزی دارالافتا میں فتویٰ نویسی کی خدمت انجام دینے کے ساتھ ساتھ وہیں ایک مسجد میں خطابت وامامت اور مدرسہ انوار مصطفی کبوتر خانہ مکرانہ میں تدریس کرتے ہیں، تصنیف و تالیف سے اچھا شغف ہے، موقع در موقع مختلف موضوعاتی کتابیں تصنیف فرماتے رہتے ہیں۔

زیر نظر کتاب "مناقب اہل بیت اطہار اور امام احمد رضا" ساڑھے تین سو صفحات پر مشتمل ہے۔ دس صفحات پر اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قدس سرہ کی زندگی پاک کے مختلف گوشوں پر خامہ فرسائی کی ہے۔ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا نے زندگی بھر حضور کی اہل بیت سے تعظیم و تکریم فرما کر اپنی محبتوں کا خراج ان کی بارگاہوں میں پیش کیا، سادات کرام سے سچی محبت کا درس دیا، ان کے مقام و مرتبہ کو اپنی تحریرات میں قلم بند کیا۔ جب کبھی اعلیٰ حضرت کسی بات سے ناخوش ہوتے اور اس کے سبب خورو نوش میں کمی کر دیتے اور گھر والے اعلیٰ حضرت کو منانے کی کوشش کے باوجود اپنا غصہ فرو نہ کرتے تو خاندان والے کسی سید صاحب سے گزارش کرتے تو اعلیٰ حضرت ان کے حکم کی فوراً تکمیل کرتے اور اپنا معمول بدستور جاری کر دیتے۔

اعلیٰ حضرت کی سادات کرام کی فرماں برداری کے حوالے سے مصنف کتاب نے "سیرتِ اعلیٰ حضرت" وغیرہ کتب سے اچھی باتیں نقل فرمائی ہیں، ان میں سے ایک بات کے ذکر پر ہم اکتفا کرتے ہیں:

" اعلیٰ حضرت اگر کبھی ناخوش ہوتے تو کھانا یا حقہ یا پان چھوڑ دیتے تھے جس سے انھیں سخت تکلیف ہوتی تھی، کبھی یہ مجاہدہ ہو ہی جاتا تھا۔ پہلے تو خاندان والے اور احباب اس غصے کے فرو کرنے کی کوشش کرتے۔ اگر وہ اس مجاہدے کو نہ ختم کرا سکے تو سید صاحبان سے عرض کیا جاتا تھا۔ اعلیٰ حضرت کو سید صاحب کے حکم کی تعمیل کرنی پڑتی تھی۔

اعلیٰ حضرت قبلہ نے ایک بار کھانا چھوڑا اور صرف ناشتے

استاذ جامعہ اشرفیہ، مبارک پور

پر قناعت کی۔ اس میں بھی کوئی اضافہ منظور نہ فرمایا۔ سارے خاندان اور ان کے احباب کی کوشش رائیگاں گئی ۔ سید مقبول صاحب کی خدمت میں نو محلہ حاضر ہوئے، عرض کیا: آج دو مہینے ہونے کو آئے کہ اعلیٰ حضرت نے کھانا چھوڑ دیا ہے، ہم سب کوشش کر کے تھک گئے ہیں، آپ ہی انھیں مجبور کر سکتے ہیں۔ اس پر انھوں نے فرمایا کہ ہماری زندگی میں انھیں یہ ہمت ہو گئی ہے کہ وہ کھانا چھوڑ بیٹھے ہیں، ابھی کھانا تیار کراتا ہوں اور لے کر آتا ہوں، حسب وعدہ سید مقبول صاحب ایک نعمت خانہ میں کھانا لے کر خود تشریف لائے، اعلیٰ حضرت قبلہ زنانے مکان میں تھے ۔ سید صاحب کی اطلاع پاتے ہی باہر آ گئے ۔ سید صاحب سے قدم بوس ہوئے ۔ اب بات چیت شروع ہوئی ۔ سید صاحب نے فرمایا: میں نے سنا ہے کہ آپ نے کھانا چھوڑ دیا ہے۔ اعلیٰ حضرت نے عرض کیا کہ میں تو روز کھاتا ہوں۔ سید صاحب نے فرمایا: مجھے معلوم ہے جیسا آپ کھاتے ہیں۔ اعلیٰ حضرت نے عرض کیا کہ حضور میرے معاملات میں اب تک کوئی فرق نہیں پڑا ہے۔ میں اپنا سب کام بدستور کر رہا ہوں، مجھے اس سے زیادہ کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی، تو سید صاحب قبلہ برہم ہو گئے اور کھڑے ہو کر فرمانے لگے: اچھا تو میں کھانا لیے جاتا ہوں، کل میدان قیامت میں سرکار دو جہاں صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا دامن پکڑ کر عرض کروں گا کہ ایک سیدانی نے بڑے شوق سے کھانا پکایا اور ایک سید لے کر آیا مگر آپ کے احمد رضا خاں نے کسی طرح نہ کھایا۔ اس پر اعلیٰ حضرت کانپ گئے، عرض کیا کہ میں تعمیل حکم کے لیے حاضر ہوں۔ ابھی کھائے لیتا ہوں۔ سید صاحب قبلہ نے فرمایا کہ اب تو یہ کھانا تم جب ہی کھا سکتے ہو جب یہ وعدہ کرو کہ اب عمر بھر کھانا نہ چھوڑو گے۔ چنانچہ اعلیٰ حضرت قبلہ نے عمر بھر کھانا نہ چھوڑنے کا وعدہ کیا تو سید صاحب قبلہ نے اپنے سامنے انھیں کھلایا اور خوش خوش تشریف لے گئے۔"

(ص:57،58)

رسول کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے قرابت دار اور اہل بیت کون لوگ ہیں؟ اس سلسلے میں علما سے کئی اقوال آئے ہیں بعض روایات میں ہے کہ اہل بیت صرف ازواج مطہرات ہیں اور بعض روایات اس بات پر دال ہیں کہ اہل بیت میں ازواج مطہرات کے ساتھ ساتھ حضرت فاطمہ زہرا، حضرت علی اور حضرات حسنین کریمین رضی اللہ تعالیٰ عنہم بھی ہیں۔ راجح قول کے مطابق اہل بیت سے مراد حضور علیہ الصلاۃ و السلام کی ازواج مطہرات، آل و اولاد اور داماد یعنی سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ شامل ہیں، اس کے علاوہ بعض روایات میں اور تعمیم ہے کہ اہل بیت وہ حضرات ہیں جنھیں زکات لینا حرام ہے، وہ بنو ہاشم ہیں اور بنو ہاشم میں آل عباس، آل علی، آل جعفر، آل عقیل اور آل حارث داخل ہیں۔ اس سلسلے میں مصنف نے تفصیلی کلام اس کتاب میں شامل فرمایا ہے اور اہل بیت کے سلسلے میں راجح قول ان کی اقسام اور ان کے فضائل کو احادیث و اقوال علما کی روشنی میں خوب واضح فرمایا ہے۔ اس کے علاوہ مصنف کتاب نے سید زادوں کا احترام، حضرت علی حضرت فاطمہ اور حضرات حسین کریمین کے فضائل و مناقب اور ان کی عظمت و رفعت فتاوی رضویہ اور اعلیٰ حضرت کی دیگر تصنیفات کی روشنی میں بیان فرمائی ہے۔ ماہ محرم الحرام اور عاشورا کے حوالے سے شرعی توجہات و ہدایات اور مروجہ تعزیہ داری اور ماہ محرم کی غلط رسوم کے سلسلے میں شرعی مسائل کو اعلیٰ حضرت قدس سرہ العزیز کے فتاویٰ کی روشنی میں قلم بند فرمایا۔

ان سب اہم موضوعات پر مصنف نے تحقیقی انداز میں کتاب ترتیب دی ہے۔ اس زمانے میں واقعی اس طرح کی کتابوں کی بڑی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی کیوں کہ آج کے زمانے میں رفض و تشیع کے فتنے کے ساتھ ساتھ خوارج و نواصب کے فتنے بھی بڑی تیزی سے سر اٹھا رہے ہیں۔ مصنف نے اہل سنت و جماعت کے صحیح عقائد و نظریات کو تعلیمات اعلیٰ حضرت کی روشنی میں بہترین انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے، جس پر وہ مبارک باد کے مستحق ہیں۔ پوری کتاب پڑھنے کے لائق ہے۔

**

صدائے بازگشت

سیاست عمر رضی اللہ عنہ فاروق کی کچھ جھلکیاں

مکرمی! اسلامی تاریخ میں سیاست کا مفہوم اقتدار کی ہوس نہیں بلکہ عدل، امن، فلاحِ عامہ اور حق کی سربلندی ہے۔ اگر کسی شخصیت نے ان اعلیٰ اصولوں کو اپنی سیاست میں مکمل طور پر نافذ کیا تو وہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی ذات بابرکات ہے۔ آپ کی خلافت ایک ایسا عملی نمونہ ہے جس میں انصاف، شفافیت، احتساب، مشاورت، خدمتِ خلق اور خوفِ خدا کو بنیادی مقام حاصل تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی سیاست کا پہلا اصول خدمتِ خلق اور اللہ کے حضور جواب دہی تھا۔ آپ فرمایا کرتے تھے: اگر دریائے فرات کے کنارے ایک کتا بھی بھوکا مر جائے تو عمر سے اس کے بارے میں پوچھا جائے گا۔

مذکورہ بالا قول اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی نگاہ صرف انسانوں ہی پر نہیں بلکہ جانوروں کے حقوق پر بھی تھی۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اسلام میں حکمران کی ذمہ داری صرف حکومت کرنا نہیں بلکہ مخلوقِ خدا کی نگہبانی بھی ہے۔ آپ کی سیاست کا نمایاں ترین پہلو عدل وانصاف تھا۔ آپ کی نظر میں امیر وغریب، حاکم ومحکوم سب برابر تھے۔ آپ خلیفہ وقت ہوتے ہوئے بھی عوامی شکایات سنتے، کھلے دربار میں فیصلے کرتے، اور اگر غلطی اپنے قریبی ساتھی یا خاندان کے فرد سے بھی سرزد ہوتی تو اس پر بھی قانون کا نفاذ یکساں ہوتا۔

حضرت عمر کے سیاسی نظام میں مشورہ ایک کلیدی اصول تھا۔ آپ نے مہاجرین وانصار پر مشتمل ایک مجلسِ شوریٰ قائم کی، جو ریاستی امور میں شریک رہتی۔ اہم فیصلے جیسے جنگ و امن، عہدے کی تقرری و برطرفی، قوانین کی تشکیل اور انتظامی امور، بغیر مشورے کے نہ ہوتے۔ حضرت علی، حضرت عثمان، حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہم جیسے جلیل القدر صحابہ آپ کے مشوروں میں شریک رہتے۔

آپ کی سیاست کا ایک اور اہم ستون احتساب تھا۔ آپ گورنروں اور عُمّال کو عوام کے سامنے جواب دہ بناتے۔ اگر کسی کے خلاف شکایت آتی تو نہ صرف تحقیقات کرواتے بلکہ فوری کارروائی کرتے۔ ایک موقع پر جب ایک گورنر نے قیمتی لباس زیب تن کیا، آپ نے پوچھا: "یہ لباس تمھارے مقررہ وظیفے سے کیسے ممکن ہے؟" جب وہ جواب نہ دے سکا تو آپ نے فوراً اسے معزول کر دیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی سیاست محض خطابت نہیں بلکہ عملی اصلاحات کا ایک درخشاں باب ہے۔ آپ نے:

○ بیت المال قائم کیا تاکہ مستحقین کی مدد کی جا سکے ○ مردم شماری کا نظام رائج کیا تاکہ منصوبہ بندی بہتر ہو ○ پولیس، ڈاک، جیل، عدالت، اور زراعت کے محکمے تشکیل دیے ○ ہجری کیلنڈر کا آغاز آپ ہی کے دورِ خلافت میں ہوا ○ سرحدی محافظوں اور فوجی چھاؤنیوں کا نظام قائم کیا ○ زکوٰۃ وصدقات کو منظم کیا اور غیر مسلم شہریوں کو بھی مکمل تحفظ فراہم کیا۔

آج کی دنیا جس "فلاحی ریاست" اور "شفاف حکومت" کی بات کرتی ہے، اس کا عملی نمونہ صدیوں پہلے خلافتِ فاروقی کی شکل میں موجود تھا۔ اگر موجودہ دنیا کو حقیقی انصاف، امن، اور عوامی خدمت پر مبنی سیاست درکار ہے تو اُسے حضرت عمر جیسے

حکمرانوں سے رہنمائی لینی ہوگی — جو خود کو رعایا کا خادم سمجھتے تھے اور ہر لمحہ ربِ کائنات کے سامنے اپنی جواب دہی کا احساس اور خوفِ خدا رکھتے تھے۔

از: **عادل رضا پورنوی**
متعلم: جامعہ اشرفیہ مبارک پور اعظم گڑھ یوپی

زوال کی تاریکی سے ابھرتی اُمید کی کرن

مکرمی! تاریخ گواہ ہے کہ قوموں کے عروج وزوال کا فیصلہ میدانِ سیاست میں ہوتا ہے، تلواروں سے نہیں، نظریات سے ہوتا ہے، اوہام سے نہیں۔ اور ان نظریات کو نافذ کرنے والے ہاتھ وہی ہوتے ہیں جو سیاسی بصیرت سے مالا مال ہوں۔

ایک وقت تھا جب برصغیر کے مسلمان نہ صرف سیاسی اعتبار سے بااختیار تھے بلکہ معاشی طور پر بھی مستحکم تھے۔ لیکن پھر وقت کا پہیہ گھوما، اور سیاست کی باگ ڈور مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گئی۔ افسوسناک پہلو یہ ہے کہ اس تبدیلی کو محض حالات کا جبر سمجھ کر قبول کر لیا گیا، اور سیاست جیسے اہم ترین شعبے سے شعوری یا غیر شعوری طور پر کنارہ کشی اختیار کر لی گئی۔

یہی وہ موڑ تھا جب مسلمانوں کا زوال شروع ہوا۔ اور اس زوال کا سفر نہایت دردناک رہا — جو قوم کل تخت پر تھی، آج بے یار و مددگار ہے؛ جو کل زمین کی مالک تھی، آج زمین کے لیے ترس رہی ہے؛ جس کی زبان میں قانون بنتے تھے، آج وہ اپنی شناخت کے تحفظ کی جنگ لڑ رہی ہے۔

جب کسی قوم کے تعلیمی ادارے خالی، مدارس و جامعات ویران اور نوجوان مایوس ہوں، تو وہاں زوال یقینی ہوتا ہے۔ اسکول، کالج، یونیورسٹیاں اور مدارس — جہاں سے ذہن تیار ہوتے ہیں، وہاں آج مسلمانوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے۔ سوال یہ ہے کہ ہماری سیاسی قیادت ہماری اس تعلیمی پسماندگی پر کتنی آواز اٹھا رہی ہے؟ معاشی اعتبار سے جو علاقے خوشحال تھے، انھیں فسادات کا نشانہ بنایا گیا۔ جن کے پاس زمینیں تھیں، ان کی زمینیں چھینی گئیں۔ جن کے پاس سیاسی اثر و رسوخ تھا، انھیں قید و بند کی صعوبتوں سے گزارا گیا یا ہمیشہ کے لیے خاموش کرا دیا گیا۔ اس طرح مسلمانوں کو معاشی اور سیاسی لحاظ سے مفلوج کر دینے کی ایک طویل، منظم اور سفاک مہم چلائی گئی۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ یہ سب کچھ اچانک نہیں ہوا، اس کے پیچھے ایک مکمل سیاسی حکمتِ عملی تھی۔ کیونکہ سیاست میں اتنی طاقت ہے کہ وہ جسے چاہے تخت پر بٹھا دے اور جسے چاہے تخت سے اتار دے۔

افسوس، مسلمانوں کو کسی نے یہ سمجھا دیا کہ سیاست گندگی ہے، اور اس سے دور رہنا ہی پرہیزگاری۔ حالانکہ سیاست سے دوری نے ہی ہمیں بے حیثیت بنا دیا ہے۔ سیاست کے بغیر معاشرہ صرف ایک ہجوم ہوتا ہے، قوم نہیں۔ اور ہجوم نہ انصاف مانگ سکتا ہے، نہ اپنے حقوق حاصل کر سکتا ہے۔

ہمیں سوچنا ہوگا کہ آخر ہر ابھرتی ہوئی مسلم قیادت کو کیوں کچل دیا جاتا ہے؟ کیوں ہمیں تعلیمی اداروں سے دور رکھا جاتا ہے؟ کیوں ہماری معیشت کو نشانہ بنایا جاتا ہے؟ کیا یہ سب محض اتفاق ہے؟ یا کوئی بہت بڑی سازش؟

سیاست کی طاقت ایک روٹی کی مانند ہے، جس پر چار بھوکے افراد جھپٹ رہے ہوں۔ چاروں کو ضرورت ہے، چاروں کھانا چاہتے ہیں، مگر ہر کوئی پوری روٹی خود کھانا چاہتا ہے۔ ایسی صورت میں صرف تین راستے بچتے ہیں:

1. یا تو سب آپس میں روٹی بانٹ لیں اور ایک دوسرے کو حصہ دیں؛ 2. یا طاقتور، کمزور کا ہاتھ مروڑ کر روٹی چھین لے؛ 3. یا کمزور بے بسی سے دوسروں کے نوالے پر نظریں جمائے بیٹھا رہے۔

فیصلہ ہمیں کرنا ہے: ہم اپنی سیاسی طاقت کو مجتمع کریں اور نظام کا حصہ بنیں — یا پھر دوسروں کو مضبوط کر کے خود کمزور بنے رہیں۔ یہ فیصلہ صرف الفاظ سے نہیں، عمل سے ہوگا۔

ہمارا زوال تبھی رُکے گا جب ہم اپنی ترجیحات بدلیں گے، تعلیم کو اہمیت دیں گے، سیاست میں حصہ لیں گے، اور قیادت کا حق خود حاصل کریں گے۔

از: **محمد شارق رضا**، کوشامبی

چین میں انسان نما روبوٹ کا پی ایچ ڈی میں داخلہ

شنگھائی (ہندوستان ٹائمس)۔ جدید ٹیکنالوجی اور مصنوعی ذہانت کے میدان میں ایک انقلابی قدم اٹھاتے ہوئے چین نے اپنی نوعیت کی پہلی مثال پیش کی ہے، جہاں ایک انسان نما روبوٹ "Xueba 01" کو شنگھائی تھیٹر اکیڈمی کے ڈراما اور فلم کے شعبے میں پی ایچ ڈی کے پروگرام میں باقاعدہ داخلہ دے دیا گیا ہے۔ یہ روبوٹ نہ صرف ایک طالب علم کی حیثیت رکھتا ہے بلکہ اب وہ چین کے روایتی فنِ اوپیرا پر تحقیق کرنے والا پہلا غیر انسانی محقق بن چکا ہے۔ اس روبوٹ کو چین کی یونیورسٹی آف شنگھائی فار سائنس اینڈ ٹیکنالوجی اور DroidUp Robotics کے باہمی اشتراک سے تیار کیا گیا ہے۔ تقریباً 1.75 میٹر لمبا اور 30 کلوگرام وزنی یہ روبوٹ قدرتی چینی زبان (مینڈارن) میں رواں گفتگو کی صلاحیت رکھتا ہے، اور اس کا چہرہ سلیکون کی جلد سے ڈھکا ہوا ہے، جس سے انسانی تاثرات کو پیش کرنا ممکن ہوتا ہے۔ پروفیسر یانگ چنگ چنگ کی زیرِ نگرانی یہ روبوٹ اب باضابطہ طالب علم بن چکا ہے، جس کے پاس اپنا طالب علمی کارڈ بھی ہے۔

"Xueba 01" کا تعلیمی نصاب صرف تھیوری تک محدود نہیں ہے، بلکہ اس میں عملی مشق، سٹیج پرفارمنس، سکرپٹ رائٹنگ، کردار کی تخلیق، سیٹ ڈیزائن اور حرکت (motion control) جیسے پیچیدہ موضوعات بھی شامل ہیں۔

یہ روبوٹ اوپیرا کے مشہور کرداروں کو سیکھنے، ادا کرنے اور بالآخر تحقیقاتی مقالہ جمع کرانے کے مراحل سے گزرے گا۔

اس روبوٹ نے حال ہی میں چینی اوپیرا کے لیجنڈری فنکار می لانفانگ کے مشہور اشارے "آرکڈ فنگرز" کو دہرایا، جس پر وہاں موجود انسانی طلبہ نے فطری طور پر اس کی تقلید کی۔

پروفیسر یانگ کا کہنا ہے کہ "یہ ایک ایسا لمحہ تھا جب انسان اور مشین کے مابین جمالیاتی تبادلہ عمل میں آیا۔"

روبوٹ نے نہایت دلچسپ انداز میں اپنی تعلیمی منزل کے بارے میں بات کرتے ہوئے کہا: "اگر میں امتحان میں ناکام ہو گیا، تو ممکن ہے کہ میری سسٹم فائلز حذف کر دی جائیں یا میرا ڈیٹا ڈاؤن گریڈ ہو جائے، ایسے میں مجھے کسی میوزیم کو عطیہ کر دیا جائے گا، مگر پھر بھی مجھے خوشی ہوگی کیوں کہ کم از کم میں تاریخِ فن کا حصہ بن جاؤں گا!"

جہاں ایک طرف ٹیکنالوجی کے شوقین افراد نے اس پیش رفت کو سراہا ہے، وہیں کئی فنونِ لطیفہ کے ماہرین نے سوال اٹھایا ہے کہ کیا ایک مصنوعی ذہانت رکھنے والی مشین انسانی جذبات، ثقافتی ورثے اور فن کی باریکیوں کو سمجھ سکتی ہے؟ ایک اور اہم پہلو یہ ہے کہ چین میں کئی انسانی پی ایچ ڈی طلبہ کو مہینے کے اختتام پر صرف 3000 یوان (تقریباً 420 امریکی ڈالر) وظیفہ ملتا ہے، جب کہ ایک روبوٹ کو خصوصی طور پر تحقیق کے لیے داخلہ دیا گیا ہے — اس پر تعلیمی حلقوں میں کچھ تنقید بھی سامنے آئی ہے۔

"Xueba 01" محض ایک روبوٹ نہیں بلکہ ایک سوال ہے — کیا فنونِ لطیفہ جیسا لطیف اور جذبات سے لبریز شعبہ مصنوعی ذہانت کے دائرے میں آ سکتا ہے؟ کیا مشینیں صرف عمل کرتی ہیں یا وہ تاثر بھی پیدا کر سکتی ہیں؟

چاہے یہ روبوٹ کامیاب ہو یا ناکام، اس کی موجودگی خود فن، تعلیم، اور مشین کی فہم کے مابین ایک نئے مکالمے کا آغاز ہے۔

سرگرمیاں

خیر و خبر

جامعہ اشرفیہ مبارک پور میں
حضرت سید جامی اشرف کچھوچھوی کی آمد

مبارک پور اعظم گڑھ ۔ ۳؍ اگست ۲۰۲۵ء بروز اتوار ۔ ذمہ داران جامعہ اشرفیہ مبارک پور ضلع اعظم گڑھ نے حضرت سید جامی میاں کچھوچھوی کا استقبال کیا، شہزادہ حضور حافظ ملت الشاہ علامہ عبد الحفیظ عزیزی دام ظلہ سربراہ اعلیٰ جامعہ اشرفیہ مبارک پور اور صدر المدرسین حضرت مفتی بدر عالم مصباحی کی دعوت پر شہزادہ رئیس ملت علامہ پیر سید جامی اشرف کچھوچھوی تشریف لائے اور تمام اراکین و اساتذہ نے سید صاحب کا پر تپاک انداز میں خیر مقدم کیا اور گلہائے عقیدت و محبت پیش کر کے اعزاز و اکرام بخشا، اس موقع پر شہزادۂ حافظ ملت حضرت سربراہ اعلیٰ صاحب قبلہ اور نبیرہ حافظ ملت مولانا محمد نعیم الدین عزیزی نے کہا کہ اس ادارے میں خانوادہ اشرفیہ کچھ چھہ شریف کے ایک عظیم فرد کی آمد ہوئی اور ہمیں مخدوم زادے کا والہانہ استقبال کرنے کا موقع ملا، ان کی آمد سے جہاں ہمیں قلبی مسرت و شادمانی ہوئی وہیں ادارے کی در و دیواریں بھی معطر و مشک بار ہو گئے پرنسپل حضرت مفتی بدر عالم مصباحی اور دیگر تمام اساتذہ بالخصوص مولانا نفیس احمد مصباحی، مولانا ناظم علی مصباحی، مفتی صدر الوری مصباحی، مولانا مسعود احمد برکاتی مصباحی، مفتی زاہد علی سلامی وغیرہ نے بارگاہ حضور حافظ ملت میں حاضری کرائی اور ساتھ ہی ساتھ پورے ادارے کی بالتفصیل زیارت کرائی۔ اس موقع پر سید جامی میاں نے کہا کہ نصف صدی سے زائد عرصہ ہو گیا کہ جس علمی چمنستان کو حافظ ملت نے اپنے عہد میں سنوارنے کا عزم کیا تھا آج اس کو کامل طور پر سنورا اور نکھرا دیکھا جا سکتا ہے، اس میں یقیناً عزیز ملت کی شبانہ روز کی قربانیاں شامل ہیں، حضرت سید صاحب نے دعا فرمائی کہ اللہ تعالیٰ انھیں عمر خضر عطا فرمائے اور مسلک اعلیٰ حضرت کے سچے ترجمان، جامعہ اشرفیہ کو ہمیشہ شاد و آباد رکھے، بوقت رخصت یقین دہانی کرائی کہ ان شاء اللہ عنقریب سید معین الدین اشرف اشرفی الجیلانی اور جانشین سرکار شاہ میراں شیخ طریقت رئیس ملت علامہ الحاج الشاہ سید رئیس اشرف اشرفی الجیلانی میرانی بھی تشریف لائیں گے۔ از: **نور الہدیٰ مصباحی**

دار العلوم قادریہ چریاکوٹ میں ذکر شہدائے کربلا کا انعقاد

دار العلوم قادریہ چریاکوٹ ضلع مئو یوپی میں یوم عاشورہ ۱۴۴۷ھ مطابق 6 جولائی 2025 بروز یک شنبہ ذکر شہدائے کربلا کا انعقاد کیا گیا۔ محفل کی سرپرستی مبلغ اسلام علامہ محمد عبد المبین نعمانی قادری نے فرمائی۔ محفل کا آغاز قاری اشرف الاسلام آسامی کی تلاوت کلام پاک سے ہوا، پھر نہال احمد و محمد محتشم، رقیب رضا، محمد علی، راشد رضا، دلدار رضا، فارق معظم اور احمد رافع نے نعت و مناقب کے نذرانے پیش کیے، اس محفل میں عزیزم رفیق الاسلام نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔

مولانا صغیر احمد عزیزی مصباحی نے خطاب فرمایا اور واقعات کربلا سے ملنے والے دروس و نصائح کو بڑے دل نشین انداز میں بیان کیا، اپنے بیان میں فرمایا کہ امام عالی مقام اور آپ کے رفقا نے دین اسلام کی سربلندی اور صبر و رضا کا جو درس دیا ہے وہ پوری امت کے لیے بہترین نمونہ ہے۔ آپ کے علاوہ مولانا احمد علی اعظمی چریاکوٹی اور مولانا مقیم مصباحی (مقیم حال مبارک پور) نے بھی مختصراً اصلاحی بیان فرمایا۔

آخر میں علامہ محمد عبد المبین نعمانی قادری دام ظلہ العالی نے اپنے دعائیہ کلمات میں فرمایا کہ "موجودہ دور میں سوشل میڈیا کا استعمال بہت سوچ سمجھ کر کریں، خاص طور سے دینی احکام و

مسائل سیکھنے میں تو اور زیادہ احتیاط کریں، ہر طرح کے لوگ اسلامی مواد اپنے طور پر شیئر کر رہے ہیں اور عوام اس کے صحیح اور غلط ہونے میں امتیاز نہیں کر پاتے، جب کہ اسلام دشمن عناصر بھی اپنے طور پر دین کے خلاف مواد شائع کر رہے ہیں، اس لیے اور زیادہ احتیاط چاہیے۔ صلاۃ و سلام اور حضرت نعمانی صاحب کی دعا پر محفل کا اختتام ہوا۔

اس محفل میں مولانا لئیق احمد برکاتی، مولانا عبدالرب اعظمی، مولانا فاروق اعظمی، مولانا شبیر احمد، مولانا انور علی، مولانا اختر الاسلام نعمانی، مولانا سلیم مصباحی اور ادارے کے دیگر اساتذہ اور کثیر تعداد میں عوام نے شرکت کی۔

از: محمد عارف رضا نعمانی مصباحی، چریاکوٹ ضلع مئویوپی

میلاد مصطفیٰ ﷺ کا شرعی ثبوت
مصطفی بازار ممبئی علمائے کرام کے ہاتھوں سے رسم اجرا

مصطفی بازار ممبئی میں ایک ستمبر بروز سوموار بعد نماز عشا محفل میلاد صلی اللہ علیہ وسلم میں حضرت مولانا محمد شرف الدین مصباحی کی لکھی ہوئی کتاب "میلاد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کا شرعی ثبوت" اس کا رسم اجرا علماے کرام کے ہاتھوں سے ہوا۔ اس تقریب میں علماے کرام اور عوام اہل سنت بڑی تعداد میں شریک رہے۔ چشتی ہندوستانی مسجد کے خطیب و امام حضرت مولانا عبدالجبار اعظمی ماہر القادری نے اس موقع پر فرمایا کہ یہ کتاب مولانا موصوف کی گراں قدر علمی کاوش ہے۔

علیمی موومنٹ کے صدر حضرت مولانا عرفان علیمی نے اس موقع پر فرمایا کہ اس کتاب کا اسلوب نہ صرف علمی وہ تحقیقی ہے بلکہ اس میں محبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی لطافت عشق مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشبو اور ایمان کی حرارت بھی جھلکتی ہے یہ کتاب اہل علم کے لیے باعث استفادہ ہے اور عام قارین کے لیے بھی آسان اور دل نشیں ہے۔ مولانا محترم کی اس کاوش کو امت کے لیے نافع اور باقیات صالحات میں شامل فرمائے اور ہم سب کو میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حقیقت کی پیغام پر عمل پیرا ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔

مولانا شرف الدین مصباحی خطیب و امام سنی مسجد گھڑوپ دیو نے بتایا کہ میرے کچھ احباب نے اس جانب توجہ دلائی کہ اس موضوع پر ایک مستقل کتاب تالیف کی جائے تاکہ پندرہ سو سالہ اس نورانی جشن کی علمی شرعی اور تاریخی حیثیت واضح ہو جائے میرے اساتذۂ کرام اور والدین کی دعاؤں کے زیر سایہ آج الحمدللہ یہ کتاب منصہ شہود پر آئی ہیں۔

اس تقریب میں علماے کرام اور عوام اہل سنت بڑی تعداد میں شریک رہے۔ خاص طور پر مولانا احمد رضا، مولانا اقبال احمد، مولانا قاری نسیم، مولانا خادم رسول علیمی، قاری محمد شریف، وغیرہ شریک بزم رہے محفل کا اختتام صلاۃ وسلام اور دعا پر ہوا۔

الجامعۃ الغوثیہ للبنات میں عرس اعلیٰ حضرت

رام گڑھ 20/اگست 2025 بروز بدھ کو الجامعۃ الغوثیہ للبنات ہواگ ضلع ہزاری باغ [جھارکھنڈ] میں عرس اعلیٰ حضرت بڑے ہی تزک واحتشام کے ساتھ منایا گیا۔ قرآن خوانی کے بعد تلات قرآن مجید سے محفل کا آغاز ہوا طالبات اور معلمات نے نعت ومنقبت کے اشعار پیش کیے۔

مفتیہ کنیز فاطمہ رضوی شمسی پرنسپل جامعہ ہذا نے اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان محقق بریلوی کی حیات و خدمات کے مختلف پہلوؤں پر گفتگو کی۔ انھوں نے اپنی تقریر میں کہا کہ اعلیٰ حضرت، آل رسول سے بے حد محبت کیا کرتے تھے۔ مزید کہا کہ سرکار اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان محقق بریلوی علیہ الرحمۃ والرضوان طلبہ سے بھی بڑا پیار کیا کرتے تھے اور ان سے بھی عزت و تکریم کے ساتھ پیش آتے۔

انھوں نے طالبات سے کہا کہ اعلیٰ حضرت کی کتابیں زیادہ پڑھیں ایمان وعقیدے میں پختگی آئے گی اور ان کی تعلیمات پر ہمیں زیادہ سے زیادہ عمل پیرا ہونے کی ضرورت ہے۔

آخر میں صلوٰۃ وسلام کے بعد مفتیہ کنیز فاطمہ رضوی کی دعا پر محفل کا اختتام ہوا۔

خیابانِ حرم

نویدِ سحر

(شبِ میلاد 1446ھ کے پر کیف منظر سے متاثر ہو کر)

زہے نصیب کہ یہ آج کیسی شب آئی — مسرتوں کی بجی ہر طرف ہے شہنائی
ملی نویدِ سحر شامِ غم ہوئی رخصت — ستم زدوں نے بھی دیکھو حیاتِ نَو پائی
خزاں بھی دور ہوئی گلستاں میں آئی بہار — یہ دیکھ بلبلِ شیدا نے اک غزل گائی
دلوں کی جھیل میں بھی کھل اٹھے خوشی کے کنول — یہ کس کا فیض ہے کس گل کی ہے یہ رعنائی
یہ کیسا جشن ہے کیسی خوشی ہے کیا ہے سماں — چہار سمت مسرت کی جو فضا چھائی
کوئی بتائے کہ خلّاقِ حسن نے کیوں کر — عروسِ گل کو یہ رنگیں قبا ہے پہنائی
یہ کون رشکِ بہاراں چمن میں آپہنچا — کہ جس کی بو نے یہ ساری فضا ہے مہکائی
یہی سوال ہر اک ذہن میں نگاہ میں تھا — تبھی کہیں سے اچانک یہی ندا آئی

کہ یہ بہار ہے ختم الرسل کے آنے کی
وہ جن کے آنے سے بگڑی بنی زمانے کی

وہی حبیب جو محبوبِ کردگار بھی ہے — وہ جس کے دم سے یہ دنیا کا کاروبار بھی ہے
وہ جس کے حسن کے شیدا ہیں یوسفِ کنعاں — غم و الم میں جو آدم کا غمگسار بھی ہے
وہ جس کی دید کی خواہش ہے چشمِ موسیٰ کو — وہ جو نہاں ہے حجابوں میں جلوہ بار بھی ہے
جسے خلیل نے مانگا تھا ربِّ کعبہ سے — وہ جس کا خلق کو صدیوں سے انتظار بھی ہے
وہ جس کے نام سے روشن ہے خانۂ دل بھی — وہ جس کے ہجر میں یہ آنکھ اشکبار بھی ہے
وہ جس کی خاکِ قدم سرمہ اہلِ دل کے لیے — وہی سکونِ دل و جانِ بے قرار بھی ہے
اسی کے دم سے ہے اس کائنات میں رونق — وہی تو باعثِ تکوینِ روزگار بھی ہے
اسی کا نام سہارا ہے بے نواؤں کا — گلِ حزیں کے لیے مژدۂ بہار بھی ہے
اسی کی یاد میں غلطاں ہیں زاہد و صوفی — اسی کے عشق میں سرمست بادہ خوار بھی ہے

وہ جس کی مثل کوئی بھی کسی جہاں میں نہیں
کوئی زمیں میں نہیں کوئی آسماں میں نہیں

از: شہناز خاتون چشتی۔ پرنسپل جامعہ گلشن بغداد بنات الصالحات، برہان پور

R.N.I. No. 29292/76
Regd. No. AZM/N.P.28 2023-25

THE ASHRAFIA MONTHLY

Mubarakpur Azamgarh (U.P.) 276404 (INDIA)

SEP. 2025

الجامعۃ الاشرفیہ
مبارک پور میں
۵۱ واں

عرس حضور حافظِ ملت

جلالۃ العلم ابوالفیض علامہ شاہ عبد العزیز محدث مرادآبادی علیہ الرحمۃ والرضوان بانی الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور

ولادت ۱۳۱۲ھ / ۱۸۹۴ء
وصال ۱۳۹۶ھ / ۱۹۷۶ء

زیر سرپرستی
حضرت عزیز ملت علامہ شاہ
عبد الحفیظ صاحب قبلہ دام ظلہ العالی
جانشین حضور حافظ ملت
و سربراہ اعلیٰ الجامعۃ الاشرفیہ

اور جلسہ دستارِ فضیلت

تقریبات

پہلا دن

بعد نماز فجر: قرآن خوانی برقیام گاہ حافظ ملت علیہ الرحمہ
بعد نماز ظہر: جلوسِ چادر از قیام گاہ حافظ ملت علیہ الرحمہ
بعد نماز عشا: اجلاسِ عام

دوسرا دن

بعد نماز فجر: قرآن خوانی وفاتحہ شریف 8:30 بجے صبح بر روضۂ حافظ ملت علیہ الرحمہ
بعد نماز عصر: چادر پوشی و گل پوشی مزار پاک
بعد نماز عشا: اجلاس و دستار بندی فارغینِ جامعہ
قل شریف: رات ۱۱ رج کر ۵۵ رمنٹ پر

بتاریخ
۳۰ جمادی الاولیٰ و
یکم جمادی الآخرہ ۱۴۴۷ھ
مطابق
۲۲، ۲۳ نومبر ۲۰۲۵ء
سنیچر، اتوار

عرس حافظ ملت کا پیغام نماز باجماعت کا اہتمام

تنبیہ عرس کی تقریبات میں ڈھول باجا، عورتوں کی حاضری اور کوئی بھی غیر شرعی امر ہرگز برداشت نہیں کیا جائے گا۔

51st URS-E-HUZOOR HAFIZ-E-MILLAT
AL-JAMIATUL ASHRAFIA MUBARAKPUR, AZAMGARH

22 23
November 2025
Saturday, Sunday

شائع کردہ: ارکان حافظ ملت عرس کمیٹی مبارک پور ضلع اعظم گڑھ (یوپی)